رجسٹرڈ نمبر ال ۱۱۰۴ جلد ۱۴ - شمار ۲

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نگار

لکھنؤ سے ہر ماہ کے پہلے ہفتہ میں شایع ہوتا ہے قیمت سالانہ ﷲ ہندوستان سے باہر علاوہ محصول ﷲ

فہرست مضامین اگست سنہ ۱۹۲۸ء

ملاحظات	نیاز فتحپوری	۲
قایم چاندپوری	ابوالمنعم سعیدی بی اے	۵
فلسفۂ مذہب	سید مقبول احمد بی اے	۱۹
من درچہ خیالیم و فلک درچہ خیال (فسانہ)	مجنوں گورکھپوری	۲۹
شاہاں بہمنیہ	تمکین کاظمی	۴۳
قابل رشک خودکشی (فسانہ)	فخر نظامی حیدرآبادی	۵۷
گزشتہ ماہ کا مضمون فلسفہ مذہب	نیاز فتحپوری	۶۵
مراثی انیس کا حیدرآبادی اڈیشن	نیاز فتحپوری	۷۰
باب الاستفسار	نیاز فتحپوری	۷۴
حصۂ نظم :-	نظامی بجھرایونی	۷۷
	آسی	
	روش صدیقی	۷۹
	حافظ غازیپوری	۸۱
	امین حزین ذوقی	۸۴
ڈائری کا ایک ورق	نیاز فتحپوری	۸۵
اقتباسات و معلومات	؍	۸۹-۹۶

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نگار

اڈیٹر:۔ نیاز فتحپوری

جلد ۱۴ | اگست ۱۹۲۸ء | شمار ۲

ملاحظات

آج مسئلہ نسائیات کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ "مدرسہ وخانقاہ" کے گوشوں سے بھی اس پر رائے زنی کی جارہی ہے اور موج کا رُخ یہ ہے کہ وہی کتب مذہبی جن سے پہلے عورتوں کے لئے "زنجیر سلاسل، قید و بند" کے احکام کا استخراج ہوتا تھا، اب اُنھیں سے یہ ثابت کیا جارہا ہے کہ موجودہ پردہ کا تشدد ایک لعنت ہے اور یکسر تعلیمات اسلام کے منافی۔ اس سے قبل نگار میں بسلسلۂ استفسار میں نے عرض کیا تھا کہ کلام مجید سے پردہ کے متعلق جو احکام مستنبط ہو سکتے ہیں وہ یہ ہیں کہ:۔

(۱) عورتیں چار دیواری کے اندر بند نہ کی جائیں۔

(۲) مناسب و ضروری پردہ کے ساتھ وہ باہر نکل سکتی ہیں۔

(۳) پردہ ایسا ہونا چاہئے جس سے آرائش ظاہر نہ ہو۔ اس لئے ہمارے یہاں کا موجودہ برقع عین اسی حکم کے مطابق ہے۔

(۴) اگر کوئی ایسا حصۂ جسم کھل جائے جس کا چلنے میں کھل جانا اور اس طرح اسکی زینت کا ظاہر ہو جانا ناگزیر ہے (جیسے ہاتھ پاؤں) تو کوئی حرج نہیں۔

لیکن میری اسی معتدل تحریر پر ایک ہنگامہ بپا ہوگیا۔ آج جناب عبدالماجد صاحب دریابادی پردہ کے متعلق ایک استفسار کا جواب دیتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں کہ عورت کا چہرہ چھپانے کی چیز نہیں اور اسلام نے اجازت دی ہے کہ وہ برافگندہ نقاب جہاں چاہے پھرے۔ لیجئے "قصہ ہی طے ہوا میں و تو کی نزاع کا"۔

اس کے آگے اب مطالبۂ "ہل من مزید" کے لئے صرف ایک ہی چیز رہجاتی ہے اور کیا عجب ہے کہ اگر کل کو ثریا بیگم (ملکۂ افغانستان) عریاں لباس رقص میں نمودار ہوجائیں، تو عبدالماجد صاحب یہ فتویٰ بھی صادر کردیں کہ جب چہرہ ہی کھل گیا، جب کوئی بے نقاب سامنے آہی گیا، جب کسی نے ہمکو اور ہم نے کسی کو یوں آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ ہی لیا اور جب حسن انسانی کا وہی حصہ جو سر فتنۂ عشق و محبت" کہلاتا ہے چھپانے کی چیز نہ رہا تو پھر سینہ وشانہ کی عریانی میں کیا حرج ہے "سیم ساق" کے دیکھنے میں کیا نقصان ہے اور کپڑے چڑھائے ہوئے پائینچے اٹھائے ہوئے "سر بازار آجانے میں کیا مضائقہ ہے۔ وائے گر وایس امروز بود فردا ئے

اللہ نے تو رسول کو سورۂ احزاب میں یہی ہدایت فرمائی تھی کہ :-

یا ایھا النبی قل لازواجک وبناتک ونساء المومنین یدنین علیھن من جلابیبھن ۰

(اے رسول اپنی بیویوں بیٹیوں اور مسلمانوں کی عورتوں کو ہدایت کردو کہ وہ اپنے اوپر نقاب ڈال لیا کریں) لیکن یہ معمہ آج عبدالماجد صاحب کے قلم حسن رقم سے حل ہوتا ہے کہ یدنین علیھن من جلابیبھن کے معنے بے نقاب ہوجانے اور چہرہ کھولکر بازار میں بے نقاب آجانے کے ہیں۔ فریاد از تطاول مژہ کمند تو!

مجھ پر وکیل ہوکر پیشۂ طبابت اختیار کرنے کا الزام تھا، آج دنیا اس طبیب حاذق کی حذاقت کا بھی مشاہدہ کرلے دنیا کے اس قائد اعظم کائنات کے اس مصلح کبیر اور عالم اسلامی کے اس ماہر قرآن وحدیث کے فتاوائے دینی کو بھی دیکھ لے۔ تاکہ آئندہ وکیل وطبیب کے امتیاز میں کسی کو التباس واقع ہو اور خیر و برکت کا وہ دروازہ جو عورت کے چہرہ کو داخل ستر نہ کرنے سے عبدالماجد صاحب نے کھول دیا ہے اس کا طرۂ امتیاز کسی ملحد دہریہ کو نہ حاصل ہوجائے۔

حال ہی میں جناب عبدالماجد صاحب کا ایک افتتاحیہ "اخبار ہمدرد" میں شایع ہوا ہے۔ جس میں انھوں نے ثابت کیا ہے کہ انگریزی ذہنیت کسی طرح ہندوستانی ذہنیت سے بالا و برتر نہیں ہے اور اس کے ثبوت میں انھوں نے استدلال پیش کیا ہے کہ اس وقت تک ایک انگریز بھی ہندوستانی زبان میں وہ مہارت پیدا نہیں کرسکا جو ہندوستانیوں نے انگریزی زبان میں حاصل کی ہے اسی طرح علم وفضل کے سلسلہ میں انھوں نے چند نام اہل ہندوستان کے شمار کرائے ہیں لیکن کیا اچھا ہوتا کہ اگر فاضل افتتاحیہ نگار اسی سلسلہ میں یہ بھی بتا دیتے کہ جب ایک قوم نہ اپنے ذہنی اکتسابات کے لحاظ سے قابل لحاظ ہے اور نہ اخلاقی حیثیت سے لایق ذکر تو پھر اس کی ترقی کا راز کیا ہے اور دوسری قوم جو علم وفضل میں بھی تفوق رکھتی ہے اور اخلاق وعادات میں بھی بلند مرتبہ والی ہے اس کے انحطاط وزوال کا کیا سبب ہے۔

کلام مجید میں ارشاد ہوتا ہے :-

وعد اللہ الذین آمنوا منکم وعملوا الصالحات لیستخلفنھم فی الارض کما استخلف الذین من قبلھم

(یعنی جو لوگ ایمان لائے اور اچھے کام کئے ان سے خدا کا وعدہ ہے کہ وہ اُنھیں دنیا میں قیام عطا فرمائے گا جس طرح اس سے قبل کے لوگوں کو قیام عطا ہوا) پھر اگر استخلاف فی الارض سے مراد وہی "چہ خورد بامداد فرزندم" ہے تو یقیناً ہندوستانیوں سے زیادہ کوئی مستحق اس کا نہیں ہے اور یقیناً تمکن فی الارض انھیں کو حاصل ہے لیکن اگر استخلاف سے مراد حکومت وثروت، جاہ وعزت

فراغدستی و خوشحالی اور ہر وہ چیز ہے جس کو "جنت عدن" سے تعبیر کیا جا سکتا ہے تو پھر یہ معمہ کیونکر حل ہو سکتا ہے کہ استخلاف اور عمل صالح میں باہم کیا نسبت ہے۔ اگر استخلاف بغیر عمل نیک کے بھی ممکن ہے تو وعدۂ الٰہی بیکار ہو جاتا ہے اور اگر یہ ناممکن ہے تو پھر وہی صورتیں ہیں یا تو استخلاف کا مفہوم دنیاوی نکبت و ذلت قرار دیا جائے یا انگریزی قوم کو تمکن فی الارض کے لئے اصلح تسلیم کیا جائے؟ تاریخ اجرا سے لیکر اس وقت تک سچ کے جتنے پرچے شائع ہوئے ہیں اگر اُن کو دیکھا جائے تو سوائے اس کے کچھ نہ نظر آئے گا کہ یورپ کے فلاں ملک میں اتنے جرایم ہوئے فلاں مقام پر سال میں اتنی طلاقیں ہوئیں، فلاں لارڈ کی لڑکی عریاں رقص کرتی ہوئی پائی گئی وہاں شراب کا اتنا صرف ہے، قمار بازی میں اتنا روپیہ ضائع ہوتا ہے، وہ یہ ظلم توڑ رہے ہیں، لیکن اس کی توفیق نہ ہوئی کہ کبھی یہ بھی بتاتے کہ فلاں عالم نے یہ ایجاد کی، فلاں ڈاکٹر نے یہ اختراع پیش کی، وہاں علم و فضل کی کیا خدمت ہو رہی ہے، فلاح قومی کے لئے کیا کیا تدابیر اختیار کی جا رہی ہیں۔ ہمارے مظلوم ہونے کے کیا اسباب ہیں ہم میں کیا نقائص ہیں اور ہم ان کو کس طرح دور کر سکتے ہیں۔

کیا کلام مجید میں "استخلاف فی الارض" کے لئے جس عمل صالح کی شرط قرار دی گئی ہے وہ یہی ہے کہ دوسروں کی عیب چینی کی جائے اور اپنے معائب کو بھی محاسن کی صورت میں پیش کیا جائے کاش کہ عبدالماجد صاحب بجائے اس سطحی مقالہ کے اصل مسئلہ کی طرف توجہ فرماتے اور غور کرتے کہ کیا ہندوستانی دماغ کی برتری ان حالات کے ماتحت سراہے جانے کے قابل ہے اور کیا سورۂ احقاف میں خدا نے یہ کلیہ قایم کر کے کہ۔

فهل يهلك الا القوم الفاسقون ط

ہم کو یہ نہیں بتا دیا کہ ایک قوم کی دماغی و ذہنی بلندی کا ثبوت اگر ہو سکتا ہے تو وہ صرف اس کی ترقی ہے اور جو قوم ہلاک ہو رہی ہے وہ یقیناً فاسق ہے، ناقابل ہے اور اس کو کوئی حق حاصل نہیں ہے کہ وہ ایک لمحہ کے لئے بھی اپنے آپ کو بہتر کہہ سکے جناب عبدالماجد کی صحافت اور انشاء کا انحصار صرف اسپر ہے کہ اہل یورپ کے معایب کو نمایاں کیا جائے اور اس غلو کا یہ نتیجہ ہوا کہ ان کا لٹریچر ہی حاسدانہ نکتہ چینی ہو کر رہ گیا حالانکہ یہ حقیقت واضح ہے کہ دنیائے عمل میں اس طرز تحریر کو صرف "کوسنا" کہتے ہیں اور اسی لئے اس کو صرف اس جنس کے لئے مخصوص سمجھ لیا گیا ہے جس کے لبوں کی جنبش اس زہر کو بھی شیریں بنا کے پیش کرتی ہے عبدالماجد صاحب سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ باوجود سعی بسیار کے بھی کبھی اس نوع کی جاذبیت اپنی جنبش لب میں پیدا کر سکینگے۔

جولائی کا مہینہ تقریباً نصف سے زاید علالت میں بسر ہو گیا، اس لئے میں کاپیوں کی صحت کی نگرانی بالکل نہیں کر سکا۔ ہر چند حالت صحت میں جب میں اس کا اہتمام کرتا تھا اسی وقت کیا کامیابی ہوتی تھی لیکن خیر کم از کم میرے دل کو تو اطمینان رہتا تھا کہ اپنے امکان میں جو کچھ تھا اس سے دریغ نہ کیا گیا۔ اس مرتبہ مجھے یہ کاذب طمانیت قلب بھی حاصل نہیں ہے

نیاز فتحپوری

قایم چاندپوری

شعرا کے حالات کی ترتیب میں بڑی مدد تذکروں ہی سے مل سکتی ہے لیکن ان تذکروں میں بڑا نقص یہ ہے کہ صحت اور شاعر کے ذاتی حالات کی طرف بہت کم توجہ کی گئی ہے جس کی وجہ سے ہم صحت کیساتھ شاعر کی شخصیت اور اس کے کردار پر اچھی طرح بحث نہیں کر سکتے اور نہ ہمیں واضح طور پر یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ شاعر کس سنہ میں پیدا ہوا کن کن سے کسب سخن کیا، کہاں کہاں کی خاک چھانی اور بالآخر کب عالم جاودانی کی راہ لی، اسیوجہ سے ہم کو شاعر کے حالات ترتیب دینے میں زیادہ تر اشعار کی زبان سے مدد لینا پڑتا ہے، عام طور پر تذکروں میں پہلے تو صحیح نام ہی درج نہیں ہوتا ہے اور اگر ہوتا بھی ہے تو مختلف تذکروں میں اس قدر زبردست اختلاف ہوتا ہے کہ کسی خاص نام کو صحیح قرار دینا مشکل ہو جاتا ہے یہی حال تاریخ وفات کا بھی ہے، چنانچہ قایم کے نام کے متعلق بھی زبردست اختلاف ہے، اگارسان دی تاسی نے تذکروں کے انہیں نقایص و معایب پر اس طرح روشنی ڈالی ہے "اہل ایران اور ان کے تتبع میں ہندی سلمان سوانح (اور خاصکر ہمعصر لوگوں کے سوانح) لکھنے کے بیحد شوقین تھے، اور جیساکہ ہمارے ہاں کا حال ہے ان میں صرف تاریخ وفات مفقود نظر آتی ہے لیکن یہ تذکرے بجائے تجارتی مفاد کے ادب کا اہم جز ہیں، ان تذکروں میں مولفین، مشہور اور ملاقاتی شاعروں کی مدح سرائی دل کھول کر کرتے ہیں اور حیلہ سے انہیں اپنی فصاحت و بلاغت اور انشا پردازی دکھانے کا خوب موقع ملتا ہے اور عمدہ عمدہ اشعار انتخاب کر کے اپنے ذوق سلیم کا اظہار کرتے ہیں، درحقیقت یہ تذکرے ایک قسم کے منتخبات ہیں جنہیں شعرا کی زندگی کے حالات پرشکوہ اور شاندار مدح سرائی تک محدود ہوتے ہیں، بعض اوقات کئی کئی صفحوں تک چلے جاتے ہیں اور اکثر ان میں سوائے شاعر کے نام کے اور کچھ بھی نہیں ہوتا، بعض اوقات مدح کے بعد دس، بیس، تیس صفحوں تک انتخابات ہوتے ہیں اور کبھی صرف دو تین شعر ہی نمونہ کے دیدئے جاتے ہیں اور کبھی صرف ایک ہی شعر ہوتا ہے، تذکرہ نویس ان تذکروں میں اپنی روشناسی اور شہرت کا پہلو نکال لیتے ہیں، بعض مصنفین یا شعرا کا ذکر کرتے کرتے اپنا نام بھی کہیں نہ کہیں لے آتے ہیں، یورپ میں سوانح عمری کے مولف کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو مصنفین یا شعرا کے ذاتی حالات تفصیل سے بیان کئے جائیں اس کے برخلاف ہندوستانی تذکروں میں ذاتی حالات کی تفصیل مطلق نہیں ہوتی صحت کا بھی بہت کم خیال کیا جاتا ہے ان شعرا کو قدیم کہا جاتا ہے جو کسی دوسرے سے پہلے گذرے ہوں اور مولف اپنے ہمعصروں کو شعرائے جدید لکھتا ہے، تاریخ اور سنہ اور خاصکر تاریخ پیدائش ان تذکروں میں شاذونادر ہی ہوتی ہے اسلئے اس کے اشعار کی زبان دیکھکر یہ قیاس کرنا پڑتا ہے کہ کس زمانہ یا کس صدی کا شخص ہے لیکن اس میں بھی دشواری واقع ہوتی ہے کیونکہ کتابوں کی نقل میں بہت سے الفاظ کچھ سے کچھ ہو جاتے ہیں" (رسالہ اردو بابتہ جنوری سنہ ۱۹۲۸ء)

اس شاعر کے بیان میں سب سے پہلا مختلف فیہ مسئلہ اس کے نام کا ہے، مختلف تذکروں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہی کہ

اس کا نام شیخ محمد قیام الدین، شیخ محمد قایم اور قیام الدین علی تھا، تذکرۂ گلشن بیخار، گلستان بیخزاں، بزم سخن اور سخن شعرا اور تذکرۂ کریم الدین میں اس شاعر کا نام شیخ محمد قیام الدین مذکور ہے اور تذکرۂ میر حسن، شمع انجمن، گلشن ہند، نکات الشعرا اور طبقات الشعرا میں شیخ محمد قائم تحریر ہے۔ ان سب سے ہٹکر مولوی عبدالحیٔ صاحب مرحوم نے تذکرہ گل رعنا میں قیام الدین علی لکھا ہے ہماری رائے میں اس شاعر کا نام دراصل شیخ محمد قیام الدین اور تخلص قائم تھا، روزمرہ کی بول چال میں چونکہ کثرت کیساتھ قایم ہی کہا جاتا تھا۔ اس لئے بعض تذکرہ نویسوں نے تخلص کے ساتھ شیخ محمد کا اضافہ کرکے اس کا نام ہی شیخ محمد قایم لکھدیا، تخلص کی شہرت نے اصل نام کو گمنامی میں ڈالدیا، چنانچہ اصلی نام کی جگہ بھی تخلص ہی نے لی،

قایم کا وطن چاندپور متعلقہ سنبھل ضلع مرادآباد تھا، والد کا نام کسی فارسی یا اردو کے تذکروں میں نہیں ملا البتہ کتب خانہ انڈیا آفس کی فہرست مرتبہ ایتھے میں، ان کے والد کا نام علی درج ہے ممکن ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ ڈاکٹر سپرنگر نے جو فہرست مرتب کی ہے اس میں "مخزن نکات" کے تحت یہ لکھا ہے کہ قایم کی خودنوشت مختصر سی سوانح عمری بھی اس کتاب کے ساتھ منسلک ہے، اسمیں قایم نے اپنے والد کا نام لکھا ہو، بہرحال یہ امر متفقہ ہے کہ قایم نے ابتدائی زندگی چاندپور میں بسر کی اور اوایل عمر میں تلاش روزگار میں وطن سے روانہ ہوا اور مردم خیز خطۂ دہلی جہاں کی علم پروری کی بہت شہرت سنی تھی پہونچا، شاہ عالم بادشاہ کے ہاں سلسلۂ ملازمت میں داخل ہو گیا۔ اور داروغہ اسلحہ خانہ بادشاہی مقرر ہوا، ملازمت کے تعلق سے عمر کا بیشتر حصہ دہلی میں بسر ہوا تحصیل علم کا حال معلوم نہیں مگر اس قدر استعداد ضرور تھی کہ ان کی انشاپردازی میں خلل واقع نہ ہوا اور یہ جوہر اس زمانہ کے شریف خاندانوں کے لئے عام تھا، دلی اس زمانہ میں آج کی سی دلی نہ تھی خواجہ میر درد، سودا، میر و حکیم ہدایت اللہ وغیرہ جیسے ارباب کمال کا جمگھٹا تھا، اور شاعری کا ہنگامہ گرم، قایم نے طبع موزوں اور ذہن رسا پایا تھا، شاعری کی طرف نظری میلان تھا صغر سنی ہی میں تصنیف نظم کا شوق پیدا ہوا، شعر و سخن کے ہنگاموں نے طبیعت میں ایک جوش پیدا کر دیا خواجہ میر درد کی خدمت میں آنے جانے لگے، چند روز ان سے فیضیاب ہوکر مرزا محمد رفیع سودا کے شاگرد ہوئے اور ایسی مشق بہم پہونچائی کہ ان کے طرز ادا کو دیکھکر سودا کے کلام کا دھوکا ہوتا ہے،

آپ کی خوش بیانی و قادر الکلامی نے اس قدر شہرت حاصل کی کہ آپ ایک مسلم الثبوت استاد مانے گئے، تمام تذکرہ نویس آپ کے مداح ہیں، آپ کے پاکیزہ و شیریں کلام نے استادان فن سے خراج تحسین حاصل کیا،

میر حسن اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں۔

"نخل حدیقۂ فصاحت و غنچۂ بستان بلاغت، شمع بزم سخندانی، چراغ نکتہ رانی، ترقی فکرش دایم شیخ محمد قایم شاعریست خوش گو شاہین طبعش تیز بال و شہباز فکرش بہ اوج کمال، خوبی اشعار چوں حسن محبوباں دلپذیر و رابطۂ الفاظش مسلسل مانند زلف خوباں بے نظیر"

مصحفی اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں۔

"پختگی کلام و چستگی مصراع غزل در قصیدہ و مثنوی وغیرہ موافق رواج زمانہ دوش بدوش استاد راہ میرفت بلکہ در بعضے مقام رجحان می جست"

مولف طبقات الشعرا رقمطراز ہے۔

"بسیار آدم با مزہ و اہل درد، متواضع، خلیق، مہذب صورت، پاکیزہ سیرت، نہایت بذلہ گو و خوش مقال و در فنون سخنوری باکمال، از خوشخیالان زماں و بلند نظران جہاں فکر صائب دارد و نازک خیالی و معنی یابی داد سخنوری میدہد"

مرزا علی لطف "گلشن ہند" میں لکھتے ہیں۔

"نظم ریختہ میں استاد مسلم الثبوت تھے، ساتھ طبع بلند اور ذہن رسا کے موصوف، مضمون تراشی اور معنی بندی میں معروف، سچ تو یہ ہے کہ بعد سودا اور میر کے کسی ریختہ گو کی نظم کا نہیں یہ اسلوب ہے راقم آثم کو طور گویائی کا اس سخن آفریں کے نہایت مرغوب ہے"

شیفتہ تذکرہ گلشن بیخار میں تحریر فرماتے ہیں۔

"شاعریست خوش گفتار بلند پایہ موزونیست عالی مقدار گرانمایہ و آنچہ بعض ناشناسان سخن بہ مکانت سودا می شمارند حرف در دیوانگی شان از جنون است بہرحال قایم در سخن دستگاہے دلپسند دارد گو بپایہ سودا مباش، لاسیمہ در قطعات و رباعیات مضامینے کہ دلالت بر شوخی فکرش کند از طبعش تراویدہ"

شاعر کی حیثیت سے قایم اپنے عہد کے ممتاز شعرا میں خیال کئے جاتے تھے، قایم نے جیسا کہ مصحفی کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے اگرچہ تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ لیکن بعض تذکرہ نویسوں کی رائے میں ان غزل اور مثنوی سے زیادہ مناسبت تھی، قطعات و رباعیات میں وہ یگانہ خیال کئے جاتے ہیں لیکن جس طرح ہم نے اوپر بیان کیا ہے شیفتہ کی رائے میں ان کی بہترین نظمیں قطعات و رباعیات ہیں، لیکن کمال (جس نے ایک تذکرہ بنام "مجموعہ انتخاب" قایم کے دس سال بعد لکھا ہے) لکھتا ہے کہ سودا کے سوا جو ہندی مسلمانوں کا مقبول شاعر ہے وہ سب سے بڑھا ہوا ہے، وہ قایم کا بیحد مداح ہے چنانچہ اس قول کی تائید میں وہ اپنے تذکرہ میں قائم کے دیوان سے اس کا بہت سا کلام نقل کرتا ہے جیسے بیانیہ، ہجویہ اور دوسری قسم کی نظمیں ہیں جو قومی خصایص کے نقطۂ نظر سے بہت دلچسپ ہیں، اس میں کوئی شک نہیں کہ قایم ان شعرا میں سے ایک ہے جو مصلح اور رواج دینے والے اس زبان کے تھے اور جنھوں نے الفاظ کریہہ کا استعمال یک قلم زبان ریختہ سے موقوف کیا قایم کی تعریف و توصیف اور ستائش میں تذکرہ نویسوں نے بہت کچھ مدح سرائی کی ہے جناب منشی کریم الدین اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں۔

"عجب طرح کا شاعر خوش گفتار ہے اس کی برابری اچھے اچھے شاعر نہیں کر سکتے کیونکہ وہ شخص اس رتبہ کا ہے کہ دیوان دیکھنے سے اُس کی قدر کھلتی ہے بعض بعض آدمی جو کہ اس کو سودا سے بہتر کہتے ہیں حق یہ ہے کہ سچے ہیں اور بعضے کم مایہ و بے استعداد جو اس کو برابر سودا کہنے میں خیال سودا اور دیوانگی کا کرتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ وہ لوگ آگ رشک میں جلتے ہیں کیونکہ مثل اس کے شعر نہیں کہہ سکتے ہیں خصوصاً قطعات و رباعیات اس کی ایسی ہیں کہ باریک بیں آدمیوں کی آنکھیں کھل جاتی ہیں جب اس کو مطالعہ کرتے ہیں"

نکات الشعرا میں میر صاحب ارقام فرماتے ہیں:-

"جوانے است، خیرو وطیرہ و حسن پرست ، نوکر پیشہ، بافقیر نیز آشنا است"

میر صاحب کا یہ لکھنا کہ حُسن پرست تھا کچھ تعجب خیز نہیں ہے اس لئے کہ اس وقت یہ روش عام تھی اور اس زمانہ کی آب و ہوا ہی کچھ ایسی تھی، شاعر کے لئے حسن پرست ہونا ضروری تھا کہ اظہار جذبات و احساسات میں واقعیت کا رنگ آسکے چنانچہ دلی کے متعلق بھی امرد پرستی ثابت ہے، خود میر صاحب بھی نگاہ ناز کے گھائل تھے۔ اپنے حسن و عشق کی داستان کو پوشیدہ رکھنے کے لئے مشق سخن شروع کی بالآخر اسی فن میں ان کو ناموری حاصل ہوئی، امردوں پر بھی جان دیا کرتے تھے، مولانا عبدالسلام ندوی نے شعر الہند میں اس کے متعلق وضاحت کے ساتھ لکھا ہے۔

قایم نہایت متواضع اور خلیق و وضعدار تھے، طبیعت میں سوز و گداز تھا، اپنے خصائل پاکیزہ کی وجہ سے لوگوں کو گرویدہ کر لیا، سخن گوئی کی وجہ سے وہ قدر و منزلت اور شہرت حاصل کر لی کہ استادان وقت کے ہمسر خیال کئے جانے لگے، معاش کی بیفکری نے کسب سخن کا اچھا موقع دیا۔ دہلی میں جو مشاعرے ہوتے تھے ان میں شرکت کرتے تھے، سودا۔ درد اور میر سے اچھے تعلقات تھے ان کے ہاں آتے جاتے رہتے تھے،

دہلی کی تباہی کے بعد یہ بھی وطن چلے گئے چنانچہ خود نوشت سوانح عمری میں لکھتے ہیں:-

"سلطنت مغلیہ کی تباہی کے بعد جب کہ وہ رشتہ جس میں تمام ملازمین منسلک تھے ٹوٹ گیا اور دہ مثل گہر آبدار ذلت و خواری کی زمین پر گر پڑے اور ہر شخص نے اس طرف کی راہ لی جہاں قدر دانی کی اُمید ہو سکتی تھی تو میں مجبور ہو گیا کہ اپنی مرضی کے خلاف بجبر و کراہ نقل مقام کر دوں"

کچھ دنوں نواب محمد امیر کے ساتھ ٹانڈہ میں زندگی بسر کی، جب ان کا بھی کام بگڑا تو رامپور چلے گئے، وہاں احمد یار خاں پسر نواب فیض اللہ خاں نے ان کی تنخواہ مقرر کر دی، کچھ دنوں اسی پر قناعت کی جب تنگ حالی سے زیادہ پریشان ہوئے تو لکھنؤ آئے اور مہاراجہ ٹکیت رائے کا شقہ اپنے وطن کے عامل کے نام لے گئے۔ یومیہ اور ملکیتں جو ضبط ہو چکی تھیں ان کو پھر بحال کرایا، اس کے بعد پھر رامپور چلے گئے۔

طبقۂ متوسطین کے دور اول کے شعرا میں سے ایک قایم ہیں، سب سے پہلا کارنامہ اس دور کے شعرا کا یہ ہے کہ زبان کی صفائی اور صحت میں پوری کوشش کی اور بہت سے الفاظ روابط جنھیں ولی اور اس کے ہمعصر بے تکلف کام میں لاتے تھے نکال ڈالے، تاہم کچھ ایسے الفاظ رہ گئے جو ان کے زمانہ میں فصیح خیال کئے جاتے تھے مگر آج ہم کو اجنبی اور نامانوس معلوم ہوتے ہیں، اس عہد کے شعرا نے دلپذیر اور دلکش وپسندیدہ محاورات اور ترکیبیں جو فارسی میں دیکھیں انھیں کہیں ترجمہ کر کے اور کہیں بجنسہٖ لے لیا اور اُنھیں اردو میں ایسی بے تکلفی سے کھپایا ہے کہ کہیں سے جوڑ نہیں کھلتا اور دور جدید میں فارسی زبان کی ترکیبیں اردو غزل گوئی کا زیور سمجھی جاتی ہیں (تذکرہ گل رعنا) فارسی زبان میں کسی چیز کی کثرت کا بیان الفاظ کی تکرار سے کرتے ہیں، چنانچہ قایم نے کہا ہے ؎

جب موج پہ اپنی آگئیں چشم
دریا دریا بہا گئیں چشم

آنکھوں سے جائے اشک گریں گل چمن چمن
منظور گریہ گر میں ترا رنگ و بو کروں

متاخرین شعرا کی فارسی کی دلاویز ترکیبیں جو شعرائے دلی کے کلام کا زیور ہیں اسی دور کی یادگار ہیں، قایم نے یوں باندھا ہے۔

اے ابر اپنے گریہ میں جس وقت جوش تھا
جو قطرہ اشک کا تھا سو طوفاں بدوش تھا

کس کی نگاہ کرم تھی گلشن پہ اے نسیم
شبنم سے برگ گل لب تبخالہ جوش تھا

ہر دم شرار و برق سے کیا ارض کیا سما
ہر ایک تیرے منہ پہ تبسم فروش تھا

اس حسن نیم رنگ کے صدقے کہ جس کے بیچ
ہلکی سی ایک شوخی کی تہ ہو حیا کے ساتھ

ویراں سرائے سینہ سے آتی ہے بوئے انس
گویا کبھو یہ خانہ ترا جلوہ گاہ تھا

قبول عذر تو واں ہو جہاں ملال بھی ہو
بجانِ پاک صفایاں جو کچھ خیال بھی ہو

ترکیبوں سے گزر کر اس دور کے شعرا نے خالص فارسی طرز ادا میں بھی بعض بعض اشعار کہے ہیں، قایم نے کہا ہے

ہی خواجہ آج نام کے پیچھے یہ سب خراب
غافل کہ کل نشان بھی پایا نہ جائے گا

اے وہ کہ تو کرے ہے ہر آزار کا علاج
جز مرگ کچھ بھی ہے ترے بیمار کا علاج

ہے اشک مجھے بنام ہر یک
گو تجھ سے کہے مری زبانی

کو نوحہ گر کہ خاک پہ میرے ہو گرم شور
تھا اک چراغ گور سو وہ بھی خموش تھا

فارسی محاوروں کے ترجمے اس عہد کے شعرا کے کلام میں نہایت کثرت سے پائے جاتے ہیں، چنانچہ قایم اس طرح طبع آزمائی کرتے ہیں ؎

دل کو کیا باندھیے گلزارِ جہاں سے بلبل — حسن اس باغ کا اک روز خزاں ہووئیگا

کچھ لکھوں سوزِ دل اپنے سو اسے اے قاصد — جائے کاغذ ہوں اگر بال و پرِ پروانہ

تا کجا مستی میں ناخوش دلِ احباب کریں — یک دو جام اور بھی ساقی کہ بس اب خواب کریں

ہر طرف ظرف وضو بھرتے ہیں اٹھو ہوئی صبح — ساقی اٹھ ہم بھی صراحی میں مئے ناب کریں

(شعر الہند جلد دوم)

اس دور کے شعرا نے یہ بھی بڑا کام کیا ہے کہ جو عاشقانہ مضامین غزلوں میں بہت پہلے سے بندھے چلے آتے ہیں ان کو بہ تبدیل الفاظ و بہ تغیر اسالیب معمولی بول چال اور روزمرہ میں اس خوبصورتی سے ادا کیا ہے کہ بار بار پڑھیے اور مزہ لیجیے، اُن کی بندشیں اگلی بندشوں سے زیادہ چست اور لطیف اور ان کے محاورے اگلے محاوروں سے زیادہ دلآویز اور دلکش ہیں، علاوہ اس کے قدیم جذبات و خیالات میں اپنے مبلغ فکر کے موافق جو نزاکتیں اور لطافتیں انھوں نے پیدا کی ہیں وہ پُرانے روزمرہ اور محاوروں کے بدلجانے پر بھی اب تک ایسی ہیں کہ لوگ ان کو پڑھتے اور سر دھنتے ہیں ملاحظہ ہو۔

قایم ضرور کیا ہے اب اس جنگجو سے صلح — مدت ہوئی کہ جان سے میں ہاتھ دھو چکا

طوفان گریہ کی ہے مرے حد عمر نوح — دریا نہیں کہ آج چڑھا کل اتر گیا (تذکرہ گل رعنا)

ان بزرگوں نے تشبیہ اور استعارہ سے بھی کام لیا ہے مگر اعتدال کیساتھ، متاخرین کی طرح صفت در صفت اور استعارہ در استعارہ کرکے کلام میں پیچیدگی نہیں پیدا کی، تشبیہ و استعارہ کو محاوروں کی رنگینی سے اس طرح کھپایا ہے کہ شعر سنکر اس کی گرمی اور جوش و خروش میں انسان ایسا محو ہو جاتا ہے کہ تشبیہ اور استعارہ کی طرف فوراً ذہن منتقل نہیں ہوتا اور یہی بات اُن کی شاعری کی جان ہے، قایم کہتا ہے ؎

سمجھا جہاں میں کوئی بھی آشفتہ سر نہیں — ہے یوں تو زلف یار پر اس قدر نہیں

دل ڈھونڈ نا سینہ میں مرے بوالعجبی ہے — اک ڈھیر ہے یاں راکھ کا اور آگ دبی ہے (تذکرہ گل رعنا)

تشبیہ و استعارہ کا موزوں و مناسب استعمال شعر کے حسن میں اضافہ کر دیتا ہے لیکن بہتر یہ ہے کہ تشبیہ محسوس چیزوں سے دیجائے تاکہ اُن کے عوارض و اوصاف زیادہ نمایاں ہو کر نگاہ کے سامنے آئیں اور اس طرح ہر ایک چیز آنکھوں کے سامنے پھر جائے دیکھئے قایم نے سادگی کے ساتھ تشبیہ کے استعمال میں جدت و ندرت بھی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے ملاحظہ ہو،

درد و غم داغ ہر اک کا ہے مجھے پاس مزاج — جوں کوئی شخص نئے شہر کو آباد کرے

مرکب تشبیہیں بھی زیادہ نادر اور بدیع خیال کیجاتی ہیں کیونکہ دو چیزوں کے اوصاف کی مجموعی ہیئت سے ایک حالت کا نقشہ زیادہ

وضاحت اور رنگینی کے ساتھ نظروں کے سامنے آجاتا ہے،

موج نفس سے ناداں غافل نہ ہو کہ تری یہ ہستی دوروزہ نخل کنار جو ہے

وہ گویا زخم ہے چہرہ کے اوپر جو بے لطف سخن کوئی دہن ہے (شعرالہند جلد دوم)

اس دور کے شعرا کا ایک بڑا کارنامہ یہ بھی ہے کہ تناسب لفظی اور صنائع و بدائع کی دوسری قسمیں خصوصاً ایہام اور ذومعنین جو قدما کی شاعری کا مایۂ ناز ہے ان کے دور کرنے میں انھوں نے بڑی کوشش کی ایہام گوئی کو ترک کرکے شعر کو بلند مضامین اور لطیف جذبات کے قابل بنانا اس دور کے شعرا کا بہترین کارنامہ ہے جو بھولنے کے قابل نہیں، مذکورۂ ذیل اشعار ملاحظہ کیجئے علوخیالی تاثرات قلبی، سادگی، نزاکت اور لطافت کی داد دیجئے،

لبریز شوق میرا از بسکہ مو بمو ہے سمجھا نہ میں یہ ابتک یہ میں ہوں یا کہ تو ہے

غنچہ نے کس کے بوسہ کو یہ لب کئے ہیں جمع گل کیوں بنا ہے باغ میں صورت کنار کی

کچھ طرفہ مرض ہے زندگی بھی اس سے جو کوئی جیا سو مر کر

بہار عمر ہے قایم کوئی دن اسے جوں گل بیارے کاٹ ہنسکر

اس دور سے پہلے شعرائے ریختہ غزل، مثنوی، رباعی، قطعہ وغیرہ سب کچھ کہتے آئے ہیں اور قصیدے بھی بلانے نام لکھے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کو قصیدہ نہیں کہہ سکتے، دو چار شعر میں کسی کی مدح کر دینے یا تشبیب، گریز، مدح اور دعا جو قصیدہ کے لوازم قرار پاگئے ہیں ان سے تعرض نہ کرنے سے کوئی کلام قصیدہ نہیں بن سکتا، سب سے پہلے اسی دور کے شعرا نے قصاید دھوم دھام سے لکھے اور ان کو اعلیٰ درجۂ فصاحت و بلاغت پر پہونچایا، اس سلسلہ بیان میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اصناف سخن میں ہر چیز کو جس سلیقہ سے اس دور کے بزرگوں نے بیان کیا ہے وہ انہیں کا حصہ تھا، قصیدوں میں پرشوکت الفاظ، بلند مضامین اور چست ترکیبیں استعمال کیں، غزلوں میں بے تکلف، زبان میں نرم نرم باتیں، عاشق و معشوق کے خیالات وصل کا ارمان، فراق کی المناک کیفیت اور جذبات انسانی کی صحیح ترجمانی جیسی انھوں نے کی اس کی نظیر قدما کے کلام میں نہیں مل سکتی، اور جوش و خروش کلام کی گرمی، اور دلاویز و دلچسپ و دلپسند بحروں میں جن میں سے اب تک بہت سی اردو میں نہیں آتی تھیں اور پھر سنگلاخ زمینوں اور مشکل ردیف و قافیوں میں شعر کی آب و تاب دیکھنا چاہو تو سودا و قایم کا کلام دیکھو اور انصاف کرو کہ اس کا دھندلا سا عکس بھی قدما کے کلام پر نہیں پڑتا، (گل رعنا) جس طرح ہم نے پہلے لکھا ہے اس عہد کے اساتذہ قصداً سنگلاخ زمینوں میں زور طبع دکھایا کرتے تھے اور اس کو باعث سرمایہ افتخار سمجھتے تھے ہم کو اس امر کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اس قسم کی ردیفوں کا نباہنا انہیں بزرگوں کے

دل و دماغ کا کام تھا، ایسی ردیفوں کو بھی اس خوبی سے نبا ہا کہ سررشتہ مضمون کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا، چنانچہ قایم نے اس طرح طبع آزمائی کی ہے ؎

جی بھی ہے، دل لیا ہی تو چل یک نشد دو شد ۔۔۔ تا پھر وہ تازہ ہووے مثل یک نشد دو شد

وعدہ جو کل کا آج پہ تھا سو ہوا اخلاف ۔۔۔ پھر آج آپ کہتے ہیں کل یک نشد دو شد

کل صبر و طاقت اسکی گلی میں ہوئے تھے گم ۔۔۔ خالی ہی آج دل سے بغل یک نشد دو شد

مسابقت یا ایک کا دوسرے پر برتری حاصل کرنے کی جد وجہد کرنا عموماً عمدہ نتائج پیدا کرتا ہے جولانی طبع دکھانے کا موقع ملتا ہے محنت و کاوش، دماغ سوزی اشتداد فکر و غور و تدقیق، جستجو و تلاش اور معنی آفرینی کی کوشش کرنا پڑتی ہے، چنانچہ شعرا کی ہمعصرانہ چشمک سے اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ زبان ثقیل الفاظ اور فارسی الفاظ کے بیجا استعمال سے آزاد ہو کر نہایت صاف اور شستہ اور مقبول عام ہوگئی، زبان کی اسی شستگی و پاکیزگی نے اس دور میں مثنوی کو اعلیٰ پیمانہ پر پہونچا دیا، چنانچہ مصحفی، میر حسن کے تذکرہ میں لکھتے ہیں

"بعد ازان کہ دور مرزا رفیع سودا شد و زبان ریختہ چنانچہ بود زیادہ دریں دیار رواج یافت بحکم قوت ممیزہ قدم بر جادۂ مستقیم رسانده و مسلم الثبوت یعنی خواجہ میر درد و مرزا رفیع سودا و میر محمد تقی و میاں محمد قایم گزاشتہ کلام خود را بمرتبہ پاکیزگی و شستگی رسانیده دیوان ضخیم و مثنوی ہائے متعددہ در سلک نظم کشیدہ خصوصاً در مثنوی آخر کہ سحر البیان نام داده ید بیضا نموده الحق کہ کار کار اوست قطع نظر از بلاغت شاعری زبانش بسیار پر مزہ و شیریں و عالم پسند افتادہ"

اسلئے اردو شاعری نے جو اب تک فارسی شاعری کے مقابلہ میں کم درجہ اور اہل کمال کی شان کے خلاف سمجھی جاتی تھی ایک ممتاز حیثیت اختیار کرلی، اور اس دور کے شعرا اُسکو خود فارسی شاعری کا حریف مقابل سمجھنے لگے، چنانچہ قایم کہتے ہیں۔

قایم جو کہے ہیں فارسی یار ۔۔۔ اس سے تو ریختہ ہے بہتر

فارسی کہنے پر افتادہ ہوگئی قایم ۔۔۔ رفتہ رفتہ جو ترے شعر صفاہان گئے

محمد شاہی دور تک اگرچہ دلی میں اردو شاعری کا عام رواج ہو چکا تھا تاہم شاعری کا جو انداز تھا وہ بہت کچھ ترمیم و اصلاح کا محتاج تھا، آبرو، حاتم اس طبقہ میں شامل ہیں جنھوں نے صنعت ایہام کو مستقل فن بنالیا تھا مگر اس صنعت کی پابندی نے اُنکے کلام کو سبک بنا دیا تھا، اس لئے اس دور کے بعد شاہ عالم کا زمانہ آیا تو مرزا مظہر جانجاناں خواجہ میر درد، فقیر دہلوی، مرزا سودا، میر تقی میر، قایم اور میر حسن جیسے مصلحین فن پیدا ہوئے تو سب سے پہلے مرزا مظہر جانجاناں نے اس طرف توجہ کی، اور ایک مستقل دور جدید و اصلاح کی بنیاد ڈالی چنانچہ قدرت اللہ شوق، طبقات الشعرا، میں لکھتے ہیں،

"می گویند کہ اول کسے کہ طرز ایہام گوئی ترک نمودہ ریختہ را در زبان اردوئے معلی شاہجہان آباد کہ الحال

پسند خاطر عوام و خواص گردیدہ مروج ساختہ زبدۃ العارفین، قدوۃ الواصلین، واقف رموز جناب

اکبر، کاشف کنوز طریقہ پیغمبر مرزا جانجاناں متخلص بہ مظہر مرویست فرشتہ صفت"

چنانچہ اساتذہ نے غزل کی ترقی میں نمایاں حصہ لیا اور اردو شاعری کے عیوب مٹا دیئے ان کو اپنی اس خدمت پر بڑا ناز تھا۔ قایم نے اس طرح تعلی کی ہے۔

قایم میں ریختہ کو دیا خلعت قبول ورنہ یہ پیش اہل ہنر کیا کمال تھا

قایم میں غزل طور کیا ریختہ ورنہ اک بات لچر سی بزبان دکنی تھی

قایم نے دوسرے شعر کے مصرعہ ثانی میں جو دعویٰ کیا ہے وہ صرف شاعرانہ تعلی ہے اُسے حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں، اردو زبان کا اصلی وطن دکن ہے جہاں تک تحقیقات بتاتی ہیں اردو زبان میں سب سے پہلے شمالی ہند کے شاعروں میں حاتم نے اس کی طرف توجہ کی اور اس طرز کو اپنی نظموں کے لئے اختیار کیا، اس سے قبل تک وہاں فارسی مستعمل تھی، اس کے برخلاف دکن میں ہم سولہویں صدی عیسوی و سترہویں عیسوی کی ابتدا میں بہت سے نامور شعرا کے نام پاتے ہیں، مثلاً شاہان گولکنڈہ، محمد قلی قطب شاہ و عبداللہ قطب شاہ ابوالحسن تانا شاہ، انوری، ابن نشاطی، افضل، غواصی، رستمی، نصرتی اور ولی وغیرہ شمالی ہند کے شعرا نے کہیں اٹھارویں صدی عیسوی میں شہرت حاصل کی، چنانچہ گارسان دی تاسی لکھتا ہے "حاتم جو سترہویں صدی کے آخر میں ہوا، دہلی کا غالباً پہلا شاعر ہے جس نے اردو میں لکھنا شروع کیا، اور اس کا اقرار کرتا ہے کہ اس نے عام زبان (اردو) میں لکھنے کا اسوقت فیصلہ کیا جب کہ ولی کا دیوان دہلی پہونچا اور پھر (شمال کے) دیگر شعرا نے اس کی تقلید کی" مولوی سید امداد امام صاحب اثر کاشف الحقایق جلد دوم میں لکھتے ہیں "جب شاہان دکن کو اورنگ زیب نے زیر و زبر کر ڈالا تب اردو نے اپنے مولد سے جلاوطنی اختیار کر کے دلی کو اپنا مسکن بنایا، ولی کا دیوان پہلے پہلے اس دار الخلافہ میں ۱۷۱۹ء میں پہونچا، یہ سنہ محمد شاہ کے جلوس کا دوسرا سال تھا، شاہ حاتم نے ولی کی تقلید شروع کی، شاہ حاتم ۱۶۹۹ء میں پیدا ہوئے اور ۱۷۹۲ء میں رحلت فرمائی اردو شاعری کے رواج دینے والے شاہ حاتم ہی گزرے ہیں"

یہ صحیح ہے کہ اس دور سے پہلے تک اردو زبان میں سنسکرت، بھاشا، اور قدیم دکنی زبان کے سیکڑوں الفاظ مستعمل تھے اور عربی و فارسی زبان کے الفاظ میں صحت کی بہت کم پروا کی جاتی تھی چنانچہ سب سے پہلے شاہ حاتم نے اس کی طرف توجہ کی اور بہت سے الفاظ کی اصلاح کر کے، اردو زبان کو پاک و صاف اور شستہ بنانا چاہا اور اس کے بعد شعرائے "مصلحین" نے اس ابتدائی اصلاح کی تکمیل میں بڑا حصہ لیا، لیکن اس کے یہ ہرگز یہ معنی نہیں ہو سکتے کہ جو زبان ان سے تقریباً سو دو سو سال بیشتر سے دکن میں مروج تھی "لچر" قرار دیجائے، عام قاعدہ ہے کہ ہر زبان کی ابتدائی حالت کسمپرسی کے عالم میں ہی زبانوں کی سرگزشت پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ جب تک کہ ارتقائی منازل طے کر کے مصلحین کی رہین منت نہ بنیں انھوں نے موجودہ اصلاح یافتہ زبان کی شکل نہ اختیار کی، انگریزی زبان پر ہی

غور کیجئے کیا چوسر، وکلف اور بن جانسن وغیرہ کے وقت کی زبان اب رائج ہے؟ نہیں ہرگز نہیں، بلکہ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ میرؔ سوداؔ و قائمؔ نے مصلح ہونے کا دعویٰ کیا اور اصلاح یافتہ زبان کا اپنے آپ کو موجد ثابت کیا ہے کیا ان کی اصلاح شدہ زبان اب زمانۂ حال میں رائج ہے؟ اس کا جواب بھی نفی میں ہے، بہت سے الفاظ اور محاورات جو اس وقت معنی خیز اور مناسب و موزوں سمجھے جاتے تھے اب متروک ہو چکے ہیں، ممکن ہے کہ ایک سو سال بعد زبان اور بھی ترقی کر جائے۔ فنون کی اصطلاحات کا جو قحط الرجال تھا وہ اظہر من الشمس ہے، دالرالترجمہ حیدرآباد نے زبان کو سائنٹفک اور فنی اصطلاحات سے مالا مال کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے، جسطرح ہمنے پہلے لکھا ہے ایک سو سال بعد زبان کا اور ہی کچھ رنگ ہو جائیگا گیا اس وقت حیدرآبادی یہ دعوی کر سکتے ہیں کہ میرؔ و سوداؔ و قایمؔ کی اصلاح کردہ زبان بالکل "لچر" تھی اور دراصل زبان جدید کے موجد ہم ہیں؟

جسطرح ہمنے اوپر لکھا ہے محمد شاہی دور کی مشہور خصوصیت ایہام گوئی تھی جس کی مظہرؔ وغیرہ نے سختی کیساتھ مخالفت کی اور اس دور کے تمام اساتذہ نے اس داغ سے اپنے کلام پاک کیا حتیٰ کہ شاہ حاتمؔ نے بھی اس طرز کو ترک کیا، قایمؔ اسی ایہام گوئی کے متعلق کہتے ہیں۔

ہو روم روم مرا کیوں نہ خوش کہ وہ بت چین ۔۔۔ یہ کہہ گیا ہے کہ آؤں گا آج میں سرِ شام

بطور ہزل ہے قائمؔ یہ گفتگو ورنہ ۔۔۔ تلاش ہے یہ مجھے ہو نہ شعر میں ایہام

وہ شعرا جو پہلے اس رنگ میں کہتے تھے انھوں نے بھی اپنی روش بدلدی اور اسی جدید طرز میں لکھنے لگے، ہم نے اوپر لکھا ہے کہ اس دور میں سب سے زیادہ اہم مسئلہ اصلاح زبان کا تھا کیونکہ قدما کے پہلے دور تک سنسکرت، بھاشا اور قدیم دکنی زبان کے سیکڑوں الفاظ مستعمل تھے، اور فارسی و عربی زبان کے الفاظ میں صحت کی بہت کم پروا کی جاتی تھی، لیکن اس دور میں سب سے پہلے شاہ حاتمؔ نے اس کی طرف توجہ کی اور بہت سے الفاظ کی اصلاح کر کے اردو زبان کو دہلی کے محاورے کے مطابق بنانا چاہا مگر اس اصلاح کی تکمیل میرؔ و مرزاؔ اور دردؔ و قایمؔ نے کی، ان بزرگوں نے قدیم محاورات و الفاظ میں تغیرات پیدا کئے، ان اصلاحات کے بعد اردو شاعری بالکل فارسی کے قالب میں ڈھل گئی، اور ہمارے شعرا نے بالکل ایرانی طرز میں کہنا شروع کیا، جن لوگوں کی طبیعت کو مضمون آفرینی سے مناسبت تھی انھوں نے ناصر علیؔ، اجلالؔ، اسیرؔ و کلیمؔ و بیدلؔ کے رنگ میں کہنا شروع کیا لیکن خوش مذاق شعرا نے طالب آملیؔ اور شفائیؔ وغیرہ کی روش اختیار کی، اچنانچہ میر حسنؔ اپنے تذکرہ میں قایمؔ کی نسبت لکھتے ہیں۔

"طرزش بطرز طالب آملی مانند"

یہ مانی ہوئی بات ہے کہ ہمارے شعرا نے فارسی کی طرز ہی کو نہ صرف اختیار کیا بلکہ ان کے کلام کو پیش نظر رکھکر شاعری شروع کی، چنانچہ بعض نے شعرائے فارسی کی غزلوں پر غزلیں لکھیں اور مقطع میں ان کا پورا مصرع نقل کر دیا، بعض نے انہیں ردیف و قافیہ میں غزلیں کہیں بعض نے اساتذۂ فارسی کے اشعار کا ترجمہ کیا اور یہ بات اس وقت نہایت عمدہ سمجھی جاتی تھی کہ اردو شاعری کو فارسی کی ناز کخیالی

مضمون آفرینی اور لطیف جذبات سے مالامال کردیا جائے۔

نظیری کا ایک شعر ہے ؎

دیدہ ام دفتر پیمان وفا حرف بہ حرف		نام خوباں ہمہ ثبت است ہمین نام تو نیست

قایم نے اس کا بالکل لفظی ترجمہ کیا ہے ؎

فہرست میں خوبان وفادار کے پیارے		دیکھا تو کہیں اس میں تیرا نام نہ پایا		(شعر الہند جلد اول)

جدید تعلیم یافتہ گروہ کا یہ اصلاحی مطالبہ ہے کہ اردو زبان کی غزلوں میں عموماً بسیط خیالات ادا نہیں کئے جاتے ہیں یعنی ہر شعر کا مضمون جُدا ہوتا ہے اور اس میں صرف ایک ہی خیال ادا کیا جاتا ہے اس لئے غزل کو قطعہ بند ہونا چاہیے جس میں اول سے آخر تک مسلسل طور پر اسی کیفیت یا جذبہ کا اظہار کیا جاسکے، قایم نے اس مطالبہ کو بھی بہت کچھ پورا کیا ہے، چنانچہ قایم کے قطعات و رباعیات کی تمام تذکرہ نویسوں نے داد دی ہے

شیفتہ تحریر فرماتے ہیں۔

"لاسیما در قطعات و رباعیات مضامینے کہ دلالت بر شوخی فکرش کند از طبعش تراویدہ"

قایم کے عاشقانہ قطعات ملاحظہ ہوں،

کان تک یار کے قایم مرے اس عالم سے		مفتہ رفتہ جو گزر جانے کا مذکور گیا
سن کے اتنا تو کہا حیف کہ اس دنیا سے		نازبرداری معشوق کا دستور گیا

یار کیوں بکتے ہو بیفائدہ مجھ سے جاؤ		اتنی کہتے ہو مجھے اتنی اسے سمجھاؤ
وہ نہیں تو کہ تجھے غم ہو کسی عاشق کا		یاکوئی جیو نصیبوں ستی یا مرجاؤ

میں کہا خلق تمہاری جو کمر کہتے ہیں		تم بھی کچھ اس کا کہیں ذکر و بیاں سنتے ہو
ہنس کے یوں کہنے لگا خیر اگر ہے یہ بات		ہو دیگی ویسی ہی جیسی کہ وہاں سنتے ہو

خوب نکلے ہم اس کے کوچہ سے		ورنہ آئے تھے اک عذاب میں رات
لیک خالی سی کچھ لگے ہے بغل		دل گرا شاید اضطراب میں رات

رباعی کا نمونہ ملاحظہ ہو:۔

دیکھ حال مرا اٹھاکے سو سو چلے ساتھی بھاگے ہر اک طرف کوجی لے
کہتی تھی جو کفش ہیں نہ چھوڑوں گی قدم سو اُسکے بھی ہو چلے ہیں ٹانکے ڈھیلے

کیا پشم ہیں دنیا کے یہ سب اہل نعیم بیقدر کریں ہم کو جو دیکھ زر و سیم
مسجد میں خدا کو بھی نہ کیجئے سجدہ محراب جو خم نہ ہو برائے تعظیم

کسی متمدن قوم اور متمدن زبان کا دوسری قوموں اور دوسری زبانوں کے اثر سے محفوظ رہنا اصول تمدن کے خلاف ہے، اسلئے یہ بات عام طور پر مشاہدہ میں آتی ہے کہ اردو شاعری نے ایک طرف فارسی زبان کے سرمایہ سے مدد لی ہے، تو دوسری طرف سنسکرت اور بھاشا کی بھی خوشہ چینی کی ہے اور ملکی خصوصیات اور ملکی رسم و رواج نے بھی اپنا اثر ڈالا، یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کی ملکی اور مذہبی خصوصیات کا اثر ہر دور کے شعرا کے کلام میں نظر آتا ہے، چنانچہ قایم بھی اس سے متاثر ہوے بغیر نہ رہ سکے،

دل میرا تم کو تو لنکا ہے دسہرہ کی تہاں فتح ہے سال بھر اُسکی جو اُسے لوٹے گا

بھری آتی ہیں قایم بے سبب آنسو سے کہے تو چشم کو میری کہیں یہ رہٹ کی گھڑیاں

یہ امر مسلم ہے کہ علم و ادب کو ہمیشہ شاہانہ سرپرستی و مربی گری کی ضرورت رہی، علوم و فنون نے اسیوقت ترقی کی جب کہ علم دوست سلاطین نے اپنی علم دوستی کا ثبوت کامادی صورت میں دیا یعنی علما و فضلا کو کسب معاش و فکر روزگار سے نجات دلائی جب تک کہ "بقائے حیات" کی جد و جہد سے ان کو اطمینان و یکسوئی حاصل نہ ہوئی وہ اپنی پوری توجہ علم و فن کی طرف مبذول نہ کر سکے، خلفائے عباسیہ کے عہد میں فنون نے جو ترقی کی وہ محتاج بیان نہیں، مغلیہ شاہنشاہوں کے سایۂ عاطفت میں جیسے باکمال اہل علم کا مجمع رہا تاریخ انکا ثبوت دیتی ہے، دکن کی اسلامی سلطنت بہمینہ نے اپنی علم دوستی کے اظہار میں جامی و حافظ کو ایران سے مدعو کیا تھا، عادل شاہی اور قطب شاہی سلطنتوں کی علمی فیاضیاں زبان زد عام ہیں، مختصر یہ کہ اہل علم اپنے کمالات کا اظہار بخوبی اس وقت تک نہیں کر سکتے جب تک کہ ان کو اطمینان قلب حاصل نہ ہو، جب تک دہلی کی دولت و ثروت، علما کے اخراجات کی متحمل ہو سکی علما و فضلا و ادبا مثل پروانہ جمع رہے اور جب تباہی آئی تو ایک ایک کرکے دہلی سے رخصت ہوئے اور تلاش روزگار میں سفر اختیار کیا، کوئی کسی نواب کے دربار تک پہونچا اور کوئی کسی امیر کے محل تک، کسی کو وزیر اودھ کے دربار تک رسائی حاصل ہوئی، الغرض تمام شعرا اور اہل کمال نبات النعش کی طرح منتشر ہو گئے، چنانچہ قایم بھی دلی سے رخصت ہو کر وطن آئے اور کچھ دنوں یہیں رہے،۔

اردو شاعری کی ترقی کا آغاز اس وقت ہوا جب کہ دکن کی اسلامی سلطنتیں کمال عروج کو پہونچ چکی تھیں، چنانچہ اردو شاعری نے انھیں سلطنتوں کے سایۂ عاطفت میں نشو و نما حاصل کیا، سلطان ابراہیم عادل شاہ، سلطان محمد عادل شاہ، علی عادل شاہ ثانی اور قطب شاہ و محمد قلی قطب شاہ و عبداللہ قطب شاہ و ابوالحسن تاناشاہ کی سرپرستی و ادب نوازی نے شعر کو کسب معاش کر بے نیاز

کردیا، اسی باعث ان کی دماغی قوتوں نے میدان تغزل کو رنگا رنگ کی چمن آرائی سے باغ و بہار بنادیا اس کے بعد محمد شاہ رنگیلے کے عہد میں اُس کی سرپرستی کی گئی اور یہ سلسلہ بہادر شاہ کے عہد تک جاری رہا، دہلی کی تباہی کے بعد اکثر شعرا نے لکھنو کا رُخ کیا، خان آرزو حملہ نادری کے بعد ہی ۱۷۳۹ء میں لکھنو چلے آئے، اسیطرح دیگر شعرا بھی وارد لکھنؤ ہوتے گئے اور لکھنو کو شاعرانہ حیثیت سے ایک قسم کی مرکزیت حاصل ہوگئی، اس لٹے ہوئے قافلہ کی سرپرستی کا آغاز اگرچہ شجاع الدولہ ہی کے زمانہ سے شروع ہوگیا لیکن شعرا کی قدر دانی کا اصلی زمانہ آصف الدولہ کے عہد وزارت سے شروع ہوا اور غازی الدین حیدر کے زمانہ تک قایم رہا، وزراے اودھ کے ساتھ لکھنؤ اور لکھنو کے علاوہ دوسرے مقامات میں امرا و رؤسا کے درباروں میں شعرا کی قدردانی ہوتی تھی، اُن میں مرزا سلیمان شکوہ نواب محبت خاں، نواب مہربان خاں رند اور نواب محمد یار خان کے درباروں سے اس دور کے اکثر اساتذہ کا تعلق تھا مصحفی مرزا سلیمان شکوہ کے دربار سے تعلق رکھتے تھے، جرات پہلے نواب محبت خان کے دربار میں تھے لیکن بعد کو وہ بھی مرزا سلیمان شکوہ کے سلسلۂ ملازمت میں داخل ہوگئے، مرزا رفیع سودا اور میر سوز نواب مہربان خاں سے تعلق رکھتے تھے، نواب محمد یار خاں امیر، نواب محمد خان مورث ڈابان رامپور کے چوتھے بیٹے اور نواب فیض اللہ خاں کے بھائی تھے، آنولہ کے قریب ٹانڈہ ایک بستی ہے وہاں کی بود و باش تھی، شعر و سخن اور سیر و شکار کا شوق تھا اول اول جب سخن گوئی کی طرف طبیعت مائل ہوئی تو اپنی استادی کے لئے میرزا رفیع سودا اور میر سوز کو بلایا، ان دونوں بزرگوں سے نواب مہربان خاں رند کے ہاں ملازم ہونے سے معذوری ظاہر کی تو بالآخر قرعۂ فال قایم چاندپوری کے نام پڑا، اور ان کو بلاکر سو روپیہ ماہانہ کردئے، اور ان سے مشق سخن کی، جس سے قایم کو استادی کا شرف حاصل ہوا، چنانچہ وہ خود اس کو اس طرح ظاہر کرتے ہیں،

جو قایم خوبی کونین ہے قصد — تو خدمت کر محمد یار خاں کی

قایم کے علاوہ اور بھی متعدد شعرا مثلاً ندوی لاہوری، میر محمد نعیم، میاں عشرت، حکیم اکبر علی سنبھلی اور پروانہ علی شاہ مراد آبادی اور مصحفی وغیرہ بھی مقربین بارگاہ تھے رات دن شعر و سخن کا چرچا رہتا تھا اور نواب صاحب موصوف جو غزل طرح کرتے تھے یہ لوگ اس کو سرانجام دیتے تھے، چنانچہ قایم نے ایک شعر میں اس اجتماع کا ذکر کیا ہے ؎

مجھ کو قایم رکھے اللہ بہت سا اے امیر — مجتمع سایہ میں ہیں جسکے سخندان ایسے

نواب صاحب موصوف کے حکم سے اس زمانہ کے مشہور مصور عاقل خاں نے ایک مرقع تیار کیا تھا جس میں نواب اور اُن کے حاشیہ نشین شاعروں کی تصویریں بنائی تھیں جو اگر اس زمانہ میں موجود ہوتا تو ایک یادگار چیز خیال کیا جاتا، (شعر الہند و تذکرہ گل رعنا) مرہٹہ گردی میں تمام لوگ بنات النعش کی طرح منتشر ہوگئے اور نواب کو فیض اللہ خاں آکر رامپور لیگئے اور پچاس ہزار روپے سالانہ ان کی جیب خاص کے لئے مقرر کردیا، ۱۱۸۸ھ میں وفات پائی، دلی کی تباہی کے بعد کچھ دن وطن میں پریشان حال رہنے کے بعد قایم کو یہاں اطمینان حاصل ہوا تھا لیکن جب یہاں بھی بخت سیاہ نے چین لینے نہ دیا تو فلک کج رفتار کو شکوہ کرتے ہوئے یہ بھی رامپور چلے گئے۔ احمد یار خان پسر نواب فیض اللہ خان نے ان کی تنخواہ مقرر کردی، کچھ دنوں اسپر قناعت کی لیکن جب

تنگ حالی سے زیادہ پریشان ہوئے تو لکھنؤ آئے اور مہاراجہ ٹیک رائے کا شقہ اپنے وطن کے عامل کے نام کے گئے، یہ پیسے اور ملکیتیں جو ضبط ہو چکی تھیں ان کو پھر بحال کرایا، اس کے بعد پھر رامپور چلے گئے، وفات تک وہیں مقیم رہے،

(تذکرۂ گل رعنا و شعر الہند جلد اول)

غرض اس دور میں شاعری ایک لازمۂ امارت بن گئی تھی اور تقریباً ہر ایک امیر کے دربار میں جیساکہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے شاعری کا ایک مخصوص صیغہ قائم ہو گیا تھا، جو شعرا کی معاش اور قدردانی کا اصلی ذریعہ تھا یہ قدردانی ایک حد تک شعرا کے لئے بہت مفید ثابت ہوئی اس لئے کہ اُن کو کسب معاش کے افکار سے نجات ملی، لیکن ایک نتیجہ یہ بھی نکلا کہ شعرا کے کلام کی تمامتر کامیابی امرا و سلاطین کی پسندیدگی پر موقوف رہ گئی چنانچہ قایم کہتے ہیں۔

ماٰنوں گا، شاعری کو میں قایم تبھی تیری سرسبز یہ غزل ہو جو نواب کے حضور

قایم مجھے کے بولیو نواب کے حضور پیارے معاملت ہے سخن آشنا کے ساتھ

باقی۔۔۔۔۔۔۔باقی

سعیدی، بی اے (علیگ) ایم آر اے ایس (لندن)

اب بھی وقت ہے

کہ آپ "ظریف شاعروں کا تذکرہ" نصف قیمت پر حاصل کر سکیں یہ تذکرہ تقریباً ۳۰۰ صفحات پر شائع ہوگا اس کی قیمت (للعہ) سے کم نہ ہوگی لیکن اگر آپ نے اشاعت سے قبل دو روپیہ ذریعہ منی آرڈر بھیجدئے تو آپ اتنی ہی رقم میں اس کے پانے کے مستحق ہو جائینگے یہ تذکرہ اس قدر مکمل دلچسپ۔ اور نئی چیز ہے کہ زبان اردو میں اس موضوع پر اس سے قبل کوئی ایسی کتاب نہیں لکھی گئی۔

سیکڑوں ظریف شاعروں کے حالات ان کے لطائف و ظرائف اور ان کا ظریفانہ کلام جو ہزاروں روپیہ صرف کر کے بعد بھی آپ کو نہیں نظر آسکتا۔ برسوں کی محنت و کاوش کے بعد ایک جگہ جمع کر دیا گیا ہے اور آپ اشاعت سے قبل اُسے صرف دو روپے میں حاصل کر سکتے ہیں۔ اشاعت کے بعد پھر کوئی رعایت نہ ہوگی یہ کتاب سوائے ہمارے اور کہیں نہیں مل سکتی۔ تھوک فروش ایجنٹ اور کتب فروش بھی اس رعایت سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں ورنہ اشاعت کے ان کو زیادہ سے زیادہ (۲۰) فیصدی کمیشن ملیگا بغیر روپیہ وصول ہوئے کوئی آرڈر درج رجسٹر نہیں کیا جائے گا۔

منیجر "نگار" نظیر آباد لکھنؤ

فلسفۂ مذہب

(بہ سلسلۂ ماسبق)

مذہب اور نبوت

نبی کا مفہوم تقریباً تمام سامی زبانوں میں وہی ہے جو عربی میں ہے۔ یعنی خبر دہندہ۔ مجھے اس میں شک ہے کہ آیا نبی مادہ "نبا" (خبر دینا۔ بتانا۔ اطلاع دینا) سے بنا ہے۔ یا نبی خود ایک مستقل لفظ جامد ہے اور اس سے نبا کا فعل مشتق ہوا ہے۔ کیونکہ عبرانی لفظ نابی یا "نابہیم" اور اسوری لفظ "نابو" مرادف الفاظ ہیں اور ان کا کوئی مادہ نہیں۔ اہل بابل میں ایک دیوتا کا نام نبو (Nebo) تھا جو نبیو سے نکلا ہے۔ یہ دیوتا انسانی مقدرات کو ظاہر کرنے والا سمجھا جاتا تھا۔ اور اس کے معنے سے وہی صفات پیدا ہوتے ہیں جو عبرانی لفظ "نابی" سے پیدا ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ جس قوم نے سب سے پہلے انسان کی ایک جماعت کا نام نبی رکھا تھا وہ اہل کنعان فنیقیا تھے۔ جن کے ہاں بعل دیوتا کے بڑے پروہت کا لقب نبی ہوتا تھا اور اس کا منصب و مشغلہ دیوتاؤں کی طرف سے غیب کی خبریں دینا تھا پروہتوں کی جماعت دو درجوں میں منقسم تھی ایک ادنیٰ اور ایک اعلیٰ۔ ادنیٰ جماعت روح کہلاتی تھی۔ مگر ان دونوں جماعت کے مشاغل وہی تھے جو کاہنوں اور رمالوں کے اکثر ہوا کرتے ہیں۔ عبرانیوں نے یا تو یہ لفظ اہل بابل کی اصطلاح سے لیا یا خود کنعانیوں سے جو اُن کے ہمسایہ تھے۔ کیونکہ عبرانی لفظ "نبہیم" کا کوئی مادہ نہیں ہے۔ بعضوں نے یہ خیال کیا ہے کہ یہ لفظ "منہبو" سے نکلا ہے جس کے معنی عبرانی میں شوریدہ سر کے ہیں۔ کیونکہ بنی اسرائیل کے نبی ظاہری حالت میں مسلمانوں کے درویش و مجاذیب سے مماثل ہوا کرتے تھے۔ مگر یہ ایک ناقابل اطمینان توجیہ ہے اور سب سے بڑی مخالف وجہ یہ ہے کہ یونانیوں نے جب کتب مقدسہ کا اپنی زبان میں ترجمہ کیا تو نبی کا ترجمہ پرافیٹس (Prophetes) کیا ہے اور جس سے انگریزی لفظ پرافٹ یعنی غیب کی خبر دینے والا نکلا ہے۔

مشہور یہودی فلسفی فیلو (Philo) نے سچے نبی کی تعریف یہ کی ہے کہ وہ صاحب جذب و حال ہو اور جو کچھ وہ کہے وہ اس کی طرف سے نہ ہو بلکہ وہ الہامی الفاظ ہوں جو اس کی خود عقل و حواس کو اپنے اندر جذب کریں۔ برخلاف ان جھوٹے نبیوں کے جو محض اپنی عقل سے کام لیکر بعض واقعات کا شگون لیتے ہیں۔

غیب دانی یا شگون کا اعتقاد تقریباً دنیا کے تمام اقوام میں پایا جاتا ہے۔ انسان چونکہ ایک پابند مخلوق ہے اور یہی وہ پابندیاں ہیں جو اس کو مذہبی اعتقاد کی طرف رجوع کرتی ہیں اور یہ پابندی انسان کے اس خاصہ سے پیدا ہوتی ہے جو ہراس موت کے نام سے مشہور ہے اس فطری خاصہ نے اس کو ہر اس چیز کا پابند و محکوم بنا دیا۔ جس کو وہ حیات بخش یا مالک تصور کرتا تھا۔ اور جیوں جیوں انسان کی عقل نے اپنے مفروضہ حیات بخش یا مالک قوتوں کو اپنا سا مجبور پایا تیوں تیوں وہ مجبور کی

معبودیت سے گزر کر جابر کی معبودیت پر آتا گیا۔ گویا شرک و بت پرستی اصل فطرت انسانی تقاضا ہے۔ اور اس کے بعد تعلیم و ترقی سے انسان توحید کی طرف پہنچتا ہے۔ جب انسان کو اپنے سے بالاتر ہستی کے وجود کا یقین ہوا اور اس نے اُن کی قبضۂ قدرت میں انسانی حیات و ممات کو سمجھا تو یہ لازم تھا کہ ایسی ہستیاں گاہ بگاہ اپنے منشا اور ارادے سے انسان کو آگاہ کر دیا کریں افلاطون نے اسی واسطے کہانت یا فال زنی کو دیوتاؤں اور انسانوں کے درمیان یگانگت کا ایک واسطہ و وسیلہ جانا ہے اور اسٹوئک فلاسفہ (Stoics) نے اس عام خیال و رواج کی تائید اسی واسطے کی ہے کہ اسپر تمام قوموں کا عمل رہا ہے اور یہی خیالات ہیں جن سے مذہب کی نشو و نما ہوتی ہے۔ فال زنی یا غیب گوئی کی مختلف صورتیں ہوا کرتی تھیں اکثر یہ اس طرح ہوتی تھی کہ انسان حالت خواب یا بیخودی میں ان ارواح انسانی سے جو مر چکی ہیں ایک قسم کا تعلق پیدا کر کے ان ذریعہ سے بعض واقعات آیندہ کی اطلاعیں حاصل کیا کرتا تھا۔ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ جیوں جیوں عقل انسانی نے ادنیٰ دیوتاؤں سے اعلیٰ دیوتاؤں کی طرف رجعت کی اسی کے ساتھ لازمی طور سے کاہنوں۔ رمالوں اور ساحروں کی جماعت نبوت کی صورت میں منتقل ہوتی گئی اور آخر میں خود بھی دیوتاؤں کی فہرست میں شامل ہو گئے۔ جن کی پرستش یا تو محض صورت الہامی کی تمثالی صورت میں جیسا رومیوں نے ایس یوکیوٹیس (Avis Eucatius) کے فرضی نام پر ایک بتکدہ بنا لیا تھا یا مصریوں کی طرح "ہرمس" (Hermes) کو انسانی شکل میں جاکر دیوتاؤں کے پیغام بر ہونے کی حیثیت سے پرستش کی۔ یا اہل بابل کی طرح مردوک کو سب سے برتر غیب گو خدا اور اس کے بیٹے "نبو" اور اس کی زوجہ "تشمت" کو الہام و نبوت کی ظاہری صورت و ہیولیٰ میں پرستش کی۔ مصریوں میں نبوت کا یہی دیوتا "توتھ" (Stotch) کے نام سے مشہور ہوا اور کہا جاتا ہے کہ وہ مصریوں کی ہدایت کے لئے بیالیس علوم کی کتابیں دنیا میں لایا۔ یونانیوں میں اپالو دیوتا کی نسبت بھی یہی اعتقاد تھا کہ اس نے اپنے پیدایش کے وقت یہ اعلان کیا تھا کہ وہ اپنے باپ خدائے "زیوس" (Zeus) کا پیغام انسانوں کو پہنچانے کے لئے بھیجا گیا ہے۔ اگرچہ اپالو کا کلام ہم تک نہیں پہنچا ہے مگر اس اعلان کے بعد یونانیوں میں غیبی لٹریچر کا اضافہ ضرور ہو گیا تھا جو "ڈلفی" (Delphi) کی اوریکل کے نام سے مشہور ہے۔ رومیوں میں "سبلس" (Sybillins) کی کتابیں الہامی وقعت سے دیکھی جاتی تھیں۔ یہ کتابیں ایک مندر میں ایک مخصوص و مقدس جماعت کے زیر نگرانی محفوظ رہتی تھیں اور احکام مذہبی و معاشرتی کے لئے اس کتاب سے استفادہ کیا جاتا تھا تاریخ سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ کتاب سے کس طرح سوال کیا جاتا تھا مگر اس واقعہ سے اس خیال کی تائید ہوتی ہے کہ ایک غیبی قانون کا اعتقاد تو یوں ہی ہمیشہ رہا ہے اور اسی کی طرف آخر میں وہ رجوع ہوتے تھے اور اس کے فال پر معاملات کے تصفیہ کو منحصر جانتے تھے۔ چنانچہ ہندوؤں۔ یہودیوں۔ مجوسیوں و مسیحیوں کے کتب مقدسہ کے الہامی دعاوی ہم سب کو معلوم ہیں اور وید، زند و استا، توریت و انجیل کے متعلق اُن مذاہب کا اعتقاد تقریباً وہی ہے جو ہم مسلمان قرآن کے لئے مانتے ہیں۔ صرف اہل چین کے مذہبی گروہ طاؤزم و کنفوشزم میں طاؤ اور کیفوسش کے اقوال کو الہامی نہیں جانتے مگر بات وہی ہے کہ

ان کے اعتقاد میں وہ خود خدا تھے۔

نبوت کی صرف دو صورتیں موجودہ مذاہب میں پائی جاتی ہیں۔ ایک تو وہ جو نبی کو عین خدا اور اس کا اوتار جانتے ہیں۔ اور دوسرا جو ان کو انسان محض مگر گناہوں سے معصوم اور اخلاق میں ایک نمونہ اور خدا کا پیام بر جانتے ہیں۔ مسیحیت ہنود وبودھ مذہب میں نبوت کی پہلی صورت ہے۔ اور مجوس۔ یہود اور اسلام دوسری صورت کو تسلیم کرتے ہیں مگر تقریباً تمام مذاہب اس بات پر متفق ہیں کہ نبوت کی خواہ کچھ ہی صفات ہوں وہ انسانی مجسمہ میں انسانوں کے معلم ہوکر دنیا میں آئے ہیں اور بقول علامہ شبلی "خدا نے جس طرح انسان کو اور مختلف قوتیں عطا کی ہیں جو بعض افراد میں بالکل نہیں پائی جاتی اور بعض میں یہ تفاوت درجات پائی جاتی ہیں۔ اسی طرح ایک روحانی قوت عطا کی ہے جس کا نام قوت قدسیہ یا ملکۂ نبوت ہے یہ قوت تزکیہ نفس اور پاکیزگی اخلاق سے تعلق رکھتی ہے۔ جس شخص میں یہ قوت موجود ہوتی ہے وہ اخلاق میں کامل ہوتا ہے اور اپنے اثر سے اور انسانوں کو کامل بنا دیتا ہے۔ یہ شخص کسی سے تعلیم وتربیت نہیں پاتا بلکہ بغیر تعلیم وتعلم کے اس پر حقایق اشیا منکشف ہوجاتی ہیں"

اب دیکھنا یہ ہے کہ نبوت کی کونسی صورت مذہب فطرت کے مطابق ہے بادی النظر میں دوسری صورت دل کو بہت لگتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ اس میں الہیات کی وہ شان پیدا ہوجاتی ہے جو توحید کا حصہ ہے اور توحید کا ماننا جیسا میں نے الہیات ومذہب میں دکھلا دیا ہے۔ انسانی ارتقاء عقلی کا مقتضا ہے۔ برخلاف دوسری صورت کے کہ وہ محض شرک وبُت پرستی یا انسان پرستی ہے اور خدا کے اکثر صفات کے منافی ہے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ نبوت کی پہلی صورت کو سمجھنا اس سے زیادہ مشکل ہے جتنا کہ دوسری صورت ہے کیونکہ خود خدا کی تعریف سے انسانی عقل عاجز ہے اس لئے خدا کی تعریف عقل انسانی سے ممکن نہیں اور جب تک خدا کی ذات وصفات پوری طرح سمجھ میں نہ آئے نبوت اور الہیات کا تعلق سمجھنا ایک نہایت مشکل امر ہے پھر چونکہ ابتدائی عقل انسانی مجبور تھی کہ اپنے ابنائے جنس میں مافوق العادۃ باتیں پاکر اسی کا پرستار و بندہ ہوجائے اور اسی کو خدا کا اوتار اور مثیل سمجھنے لگے یہ خیال اس قدر فطری اور عام ہے کہ ہمارے جاہل صوفیہ میں وصل وعرس کی اصطلاحیں موجودہ اولیا اللہ کی وفات وبرسی کے لئے استعمال کرتے ہیں وہ درحقیقت انہیں خیالات کا پرتو ہیں گویا کہ اکابر دین میں خدا کی روح حلول تھی اور ان کے جسم سے چھوٹکر وہ روح اپنی وصل روح سے مل کر ایک ہوگئی۔ گو وہ اس بات کے علی الاعلان قائل نہیں ہیں کہ اولیاء اللہ کی ارواح خدا کا کل ہے یا جز کیونکہ انہیں سے ایک اقرار کے بعد وہ توحید اسلام سے بہت دور جا پڑتے ہیں لیکن اگر وصل کا لفظ کوئی معنی رکھتا ہے تو کسی کے موت کو واصل بحق کہنا محض ویدانت کی تفسیر ہے۔ نہ اسلام کی۔ اور جو لوگ کہنے کے عادی ہیں کہ فلاں بزرگ کا وصال ہوگیا وہ درحقیقت بے خبری سے ہندوؤں کی تقلید کرکے اُن کو ممنون بناتے ہیں اسیطرح گروہ پیرزادگان میں عرس کی اصطلاح سمجھ میں نہیں آتی کیا عجب کہ تخیلات شاعری نے وصل کو عروسی کا لازمی نتیجہ سمجھکر اللہ میاں اور مرنے والے بزرگ کے نکاح کی ٹھہرائی ہو۔ اور یہ بیہودہ خیالات اس درجہ پستی کو پہنچ گئے ہیں کہ بعض بدبخت "سدا سہاگن" کا مسخرہ پن کرکے وہ ناپاک مظاہرات قبور پر کیا کرتے ہیں۔ جو سیدنا عمر کو قبر میں تڑپا دیں

کے لئے کافی ہیں۔

الغرض انسان نبوت کے اس خیال کو اس وقت ترک کر سکتا ہے جبکہ وہ خدا کو شخص مانے اور ــــــــ غیر مفہوم خدائی ہستی کو انسان کا ہم شبیہ و مثل بنایا جائے یعنی خدا کی صورت ایک جلیل القدر بادشاہ کی طرح ہو۔ اور جس طرح انسان اپنے قوا کی مدد سے غصہ کرتا۔ روتا۔ افسوس کرتا۔ ہنستا یا بات چیت کرتا ہے۔ اسیطرح وہ خدا بھی کرتا ہے اور جس طرح بادشاہ تخت پر متمکن ہو کر اپنے سفراء وزرا کو رعیت میں بھیج کر اپنے ارادے سے ان کو خبر کرتا ہے۔ اسی طرح یہ خدا بھی چند برگزیدہ لوگوں کو وقتاً فوقتاً اپنی طرف سے اپنے بندوں میں بھیجکر اپنے ارادۂ خداوندی سے آگاہ کرے بغیر اس تصور کے نبوت کی دوسری صورت مشکل سے سمجھ میں آتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ بنی اسرائیل جو نبوت کی دوسری صورت قبول کرتے ہیں۔ وہ بغیر خدا کو مجسم اور انسانی صفات کا مانتے ہوئے نبوت کو اس حد پر قائم نہ رکھ سکتے تھے۔ چنانچہ کلام آلہی کی بھوری ان کے ہاں ایسی طفلانہ ہے جسکو سنکر ہنسی آتی ہے، ہیکل کے پردے کے پیچھے یا آگ کے شعلوں میں خدا اتر کر اپنے فرستادہ سے ہم کلام ہوتا ہے۔ اور جب اسکو کوئی تحریری حکم دینا ہوتا ہے تو پتھر کے ٹکڑوں کو منگوا کر اسپر اپنی انگلیوں سے لکھ دیتا ہے۔ تکلم الناس علیٰ قدر عقولہم عربی کی ایک مشہور ضرب المثل ہے اور الہام کی یہ بھونڈی صورت جو یہود مانتے ہیں وہ درحقیقت ان کے سمجھ کے مطابق بتائی گئی ہے اور یہی وجہ ہے کہ بنی اسرائیل کی توحید کے باوجود ان میں ایسے مراسم کا شدت سے پایا جانا جو عموماً بت پرست اپنے دیوتاؤں کے لئے کیا کرتے ہیں۔ مثلاً قربانی کرنا۔ یا بخور جلانا وغیرہ وہ محض اس بات کا پتہ دیتا ہے کہ ابتدائی زمانہ میں انسانی عقل جب تک معبود کو اپنا مثل نہ جانے وہ اس کو سمجھنے یا قبول کرنے کی قابلیت نہ رکھتا تھا اور بنی اسرائیل تاریخ میں وہ قوم ہے جس سے ہم یہ پتہ لگا سکتے ہیں کہ انبیاء کس طرح ایک عاقل، زمانہ شناس مدبر کی طرح قوموں کو الہیات و مذہب کی تعلیم دیتے تھے اور ان کو وہی باتیں سکھاتے تھے جو انکی سمجھ میں آسکیں یا انکا ماحول جس حالت کا ان کو عادی بنا رہا ہو اور ان کی ان طفلانہ فعلوں سے اسوقت تک تعرض نہ کرتے تھے جب تک ان کے ان اعمال سے اصل مقصد توحید کا فوت نہ ہو جائے۔ چنانچہ اسلام میں مناسک حج کی اجازت اسی مصلحت پر مبنی ہے۔ انبیاء بنی اسرائیل نے صرف اتنا کام کیا ہے کہ تمام مختلف معبودوں کی جگہ ایک معبود "یہود" کو قرار دیکر اس کی عبادت کی طرف اپنی قوم کو مائل کر دیا اور طریقہ عبادت میں وہی باتیں رہنے دیں جو بت پرست اور مشرکین اپنے متعدد معبودوں کے لئے بجا لاتے تھے مگر جب محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی تجدید اپنے دور میں کی تو وہ زمانہ ایسا تھا کہ انسانی عقول پستی سے بلندی کی طرف مائل ہو چکی تھیں اس لئے اسلام کا نظریہ الہیات اور نبوت کے متعلق وہی ہے جس کو تقریباً آج کل کے یورپ کے فلاسفر بھی قبول کرنے کو تیار ہو سکتے ہیں۔ اسلام جہاں نبوت کو الہیات سے جدا مانتا ہے وہ اللہ کو نور السموٰت والارض بھی مانتا ہے۔ ایک طرف غیر مجسم منزہ۔ ازلی نور ہے اور دوسری طرف انسان کا کالبد خاکی و فانی۔ پس اسلامی نبوت کے لئے تنقیح طلب یہ مسایل ہو جاتے ہیں کہ یہ دو متضاد باتیں کیونکر باہمی تعلقات پیدا کر سکتی ہیں اور اگر خدا اپنی قدرت کے وسعت سے ایک مبدے سے تعلق پیدا کرتا ہے یا کرنے پر قادر ہے تو پھر ایک

مخصوص جماعت نبیوں کی ضرورت ہی کیا ہے اس کا کلام ہر شخص کے دل پر القا ہو سکتا ہے اور ہر شخص کو فطرتاً برگزیدہ بنا سکتا ہے۔ پھر خدا کے کلام کے کیا معنے ہیں اور اس کی کیا کیفیت ہے۔ آیا وہ کلام خدا کی طرح خالق اور ازلی ہے یا مخلوق و فانی۔ اس کا کلام بندے تک کس طرح پہنچتا ہے اور کون سے معیار ہیں جن سے ہم ایک کلام کو الہامی کلام قرار دیں۔

اگر خدا غیر مجسم اور ایک لامکان نور ہے تو افلاطون اور فیلو کا یہ مقولہ ایک حد تک قابل اعتنا ہے کہ ایسی صورت میں خدا کی صفات پر کلام کرنا ممکن نہیں۔ کیونکہ صفات ازلیت و لامکانیت کے متناقض ہیں صفات سے ہم ایک چیز کو محدود کر دیتے ہیں اور خدا محدود نہیں ہے وہ ازلی غیر مبدل جوہر لامحدود کافی ہے اور ان صفات انسانی سے بالاتر ہے جو ہم اس کے لئے تصور کر سکتے ہیں۔ ہم صرف خدا کے بارے میں یہی کہہ سکتے ہیں کہ وہ موجود ہے مگر یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ کیا ہے اور محض اس کی ذات کو صفات سے علٰحدہ رکھ کر ہم اس کو مخلوقات سے علٰحدہ اور بالاتر درجہ دے سکتے ہیں۔ صفات کے انکار کے ساتھ ہم صرف اس قدر کہہ سکتے ہیں کہ وہ کامل ہے اور کمال کی تمام خوبیاں اس میں ہیں اس کا وجود تمام کائنات پر حاوی ہے۔ ان خیالات کو مانتے ہوئے خدا کے تعلقات عالم سے سمجھ میں نہیں آتے کیونکہ جب ایک ذات صفات سے منزہ و مبرہ ہے تو یہ کیونکر ممکن ہے کہ اس کا تعلق کائنات کے کثیر لا تعداد اشیاء سے اسی طرح تصور کیا جائے جس طرح ایک بادشاہ کا اپنی رعیت سے ہے خدا کا برتر مکمل اور منزہ ہونا اور مخلوقات کا اس کے برخلاف کمتر ادنیٰ اور ناقص ہونا اجتماع ضدین ہے اس لئے فلاسفہ یونان نے خدا اور کائنات کے تعلقات کے امکان کے لئے ایک نظریہ قایم کیا ہے۔ اور ان دونوں کے درمیان حکمت خداوندی کو ایک واسطہ ٹھیرایا ہے۔ یونانیوں میں اس حکمت خداوندی کو لوگس (λογος) کہتے ہیں جس کا لفظی و اصطلاحی ترجمہ ہمارے یہاں کلام ہے۔ خدا میں کوئی صفات نہیں۔ لیکن وہ غیر محدود اقسام کی حکمت خداوندی کا سبب ہے اور اسی کے وسیلے سے خدا اور کائنات میں تعلقات قایم ہوتے ہیں۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ خدا اور لوگس یا کلام میں خود کیا تعلقات ہیں۔ اسٹوئک فلاسفہ کے نزدیک خود کلام خدا ہے اور اسی کی آواز بازگشت ہم کو انجیل یوحنا کے پہلے باب کی پہلی آیت میں ملتی ہے یعنی "ابتدا میں کلام تھا۔ اور کلام خدا کے ساتھ تھا اور کلام خود خدا تھا" لیکن فیلو کے نزدیک یہ کلام وہی ہے جو بنی اسرائیل میں ملائکہ کے نام سے موسوم ہیں اور یونانیوں میں دیوتاؤں کے نام سے یعنی وہ بھی ایک قسم کی مخلوق ہیں جو بندے اور خدا کے درمیان واسطہ رکھتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فلاسفہ میں کلام کی ماہیت میں خود اختلاف ہے۔ ایک طرف تو یہ قول کہ وہ بذات خود کوئی چیز نہیں بلکہ مخلوقات کے لئے ایک حکمت خداوندی ہے جو خدا سے مصدر ہے اور اس لئے وہ خدا کے وجود کا محض انعکاس یا پرتو ہے۔ جس طرح روشنی سے اس کی شعاعیں نکلتی ہیں لیکن اس کا وجود خدا سے علٰحدہ بھی تصور کیا جاتا ہے جو بذات خود موجود ہے۔ مگر جیسا زیلر (Zeller) نے کہا ہے اختلاف لازمی نتیجہ اس نظریہ کا ہے جو فیلو نے بہ اثر مذہب یہود قایم کیا ہے۔ کیونکہ ایک طرف اس کا یہ قول ہے کہ خود خدا اپنے حکمت خداوندی سے کام کرتا ہے اور اس لئے یہ حکمت خدا اور خود خدا ایک ہی اصل ہے اور دوسری طرف اس کا یہ قول ہے

کہ مخلوق وخالق باہم مل نہیں سکتے کہ یہ اجتماع ضدین ہے اور اس لئے جو حکمت اس سے صادر ہوتی ہے وہ لازمی طور سے دونوں کے بین بین ایک علٰحدہ چیز ہوگی فیلو کا خیال ہے کہ عقول دنیاوی عقل کامل کا پرتو ہیں جو لوگس یا حکمت خداوندی کہلاتا ہے اس لئے لوگس خدا اور بندے کے درمیان واسطہ ہے اور یہی وہ عظیم روح یا ملائکہ ہیں جس کے تابع الہام ہیں اُسکے ذریعہ عالم کی خلاقی ہوئی اور وہ خدا کے کلام کے ہم معنے ہے۔

اب اگر ہم مشاہدات و بدیہیات سے کام لیں تو انسانوں کے اندر ہم کو بعض ایسے ادراکات کا پتہ چلتا ہے جو طبائع کے ساتھ مخصوص ہوتا ہے اور وہ باتیں ہر شخص میں نہیں پائی جاتیں۔ یہ مشاہدات اس کثرت سے ظہور میں آتے ہیں کہ انکی بنا پر اب تفتیش روحانیات (Psychical research) ایک خاص علمی شغلہ ہوگیا ہے۔ ان مناظر کو جو قدیم الایام سے لیکر آج تک آسیب کے ناموں سے مشہور ہیں اور جن کی تائید میں انجیل کی مستند روایتیں بھی موجود ہیں اس سے یہ قیاس بجا طور سے کیا جا سکتا ہے کہ انسان بعض اوقات کسی خارجی وغیر مرئی شے سے ایسا متاثر ہو جاتا ہے کہ اس کے افعال و سکنات و اقوال ایک دوسری خارجی اور غیر مرئی ہستی میں جذب ہو جاتے ہیں اور جو کچھ انسان کہتا ہے یا کرتا ہے وہ خود اپنی طرف سے نہیں کہتا۔

میرا اگرچہ اپنا کوئی ذاتی مشاہدہ نہیں ہے مگر روایتیں ایسی معتبر اور متواتر ہیں کہ اس میں شبہ کی گنجایش نہیں رہی چنانچہ گورکھپور کے ضلع میں ایک دیہات ہے جس کا نام میرے ذہن سے اتر گیا وہاں ایک کمسن دیہاتی لڑکی پر یکایک ایک کیفیت طاری ہوگئی اور اس نے نہایت قرات وخوش الحانی سے قرآن کو زبانی پڑھنا شروع کیا اور یہ کیفیت کئی بار اسپر طاری ہوئی راوی نے جو ضلع بستی کے ایک معزز وکیل ہیں انھوں نے مجھ سے بیان کیا کہ لڑکی جس لہجے اور قرات سے قرآن پڑھتی تھی وہ بالکل ایک حافظ کی آواز سے مشابہت رکھتی تھی جو دس بارہ سال ہوئے مرچکا تھا اور اس کی تائید لڑکی کی زبان سے اس حافظ کی روح نے خود کی۔

اسی طرح بہار کے رہنے والے ایک نہایت ثقہ مسلمان نے جو عرصے تک خود میرے اجلاس کے پیشکار تھے مجھ سے اپنا ایک چشم دید واقعہ بیان کیا کہ ایک کانسٹبل جو رات کو گشت کو نکلا تھا جب اپنی چوکی پر واپس آیا تو یکایک انگریزی لہجے میں اس نے بولنا شروع کر دیا، اور وہ لہجہ ایک متوفی انگریز انسپکٹر پولیس کا تھا۔ جو چند سال قبل ایک تالاب میں مچھلی کا شکار کرتے ہوئے ڈوب گیا تھا۔ لوگوں نے اُس روح سے پوچھا کہ تم اس غریب سپاہی کو کیوں پریشان کر رہے ہو تو اُس نے کانسٹبل کی زبان سے جواب دیا کہ یہ شخص تالاب کے پاس سے گزرا اور ہم کو سلام نہیں کیا اس لئے ہم اسپر سوار ہو گئے۔

غرضکہ دنیا میں ایسی باتیں ہیں جن کے لئے کوئی تاویل مشکل ہے۔ اتنا تو کم سے کم ہر شخص تسلیم کر سکتا ہے کہ خود انسان میں ایک ایسی مقناطیسی قوت ہے جس کی طاقت سے وہ بغیر کسی ظاہری سلسلہ کے اپنے معمول پر اثر ڈال سکتا ہے بس جب ارواح دنیاوی انسان پر ایسا اثر ڈالنے کی قابلیت رکھتے ہیں تو کیا یہ ممکن نہیں کہ خدائی روح اس کی قوت ارادہ انسان پر اسیطرح

اثر ڈالے جس کو ہم اصطلاح میں القا یا الہام یا وحی کہتے ہیں۔ اس قوت کو خواہ لوگس کہا جائے یا ملائکہ یا روح مگر اُس کے واقعہ ہونے میں کوئی بات خلاف قیاس نہیں معلوم ہوتی۔ اس لئے الہام وہ خاص قسم کی کیفیت ہے جو ایک مخصوص ظرف کے انسان میں القاء ہوتی ہے اور اس کے اثر سے خود اس کے اپنی طبعی احساسات اس وقت تک کے لئے معطل ہو جاتے ہیں۔

یہی نظریہ افلاطون کا کتاب تیماوس (Timaeus) میں ہے اور چونکہ انسانی قوا و تخیلات میں بین فرق ہے ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ عمل دنیا میں ہر انسان کی قابلیت پر نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے لئے ضرورت ہے کہ ایک خاص قابلیت کا انسان ہو اور اس قابلیت کے انسان کو ہم نبی کہتے ہیں۔

اب صرف تنقیح طلب دو امور رہ گئے ہیں۔ انسان کیوں نبی ماننے کے لئے مکلف ہے اور نبی کے کلام یا الہام کا معیار کیا ہے۔ ہم اس فلسفی بحث کو اس عنوان میں اٹھانا نہیں چاہتے کہ الہام کی ماہیت کیا ہے۔ اور یہ کہ وہ مخلوق ہے یا ازلی مامون رشید کے زمانہ میں یہ مسئلہ علمائے اسلام میں ایک بڑا اہتم بالشان مسئلہ تھا لیکن وہ حرفاً حرفاً یونانیوں کے فلسفیانہ افکار سے مسلمانوں میں آیا ہے۔ اور یونان کے قدماء اور مسیحیوں نے لوگس پر جو کچھ بحث ہے بجنسہ وہی بحث مسلمانوں نے قرآن کے لئے اختیار کی ہے۔ بلکہ ڈنکن نلڈ ــــــ کی رائے سے مجھے اتفاق ہے کہ علم کلام اسلام میں اول محض لوگس کے مباحث کا نام تھا اور بعد کو غلطی سے اور نمودی اشتباہ سے یہ لفظ تمام مذہبی مناظرات و مباحث کے لئے نامزد ہو گیا مسلمانوں نے لوگس کے بحث میں کوئی جدت نہیں کی۔ مختصراً انکی ساری بحث کا فخریہ ہے کہ قرآن خدا کی طرف سے ایک علم ہے۔ اس لئے وہ خدا کے صفت علم سے جدا نہیں۔ لیکن وہ ازلی اور غیر مخلوق ہے۔ لہذا قرآن بھی ایسا ہی ہے۔ خدا نے کن کا امر کیا اور دنیا پیدا ہوئی۔ لیکن یہ لفظ کن مخلوق نہیں ہے ورنہ مخلوق دنیا کا خالق ہو گا۔ قرآن شریف میں ہے "آیا مخلوق اور حکم اللہ کا نہیں"۔ یہاں پر امر مخلوق سے جدا ہے لہذا خدا کے امر نے کائنات کی خلقت کی اس لئے وہ مخلوق نہیں ہو سکتا اسی طرح خدا کا کلام جو نبی کو دیا جاتا ہے وہ غیر مخلوق اور ازلی ہے۔ معتزلہ نے اس خیال کی مخالفت کی اور انھوں نے قرآن کے لئے اس قدر کافی سمجھا کہ وہ اسی کا کلام ہے جو ایک خاص اثر سے نبی اپنے زبان سے ادا کرتا ہے اور ان کا طرز استدلال قریب قریب اس سے ملتا ہے جو انیسویں صدی علماء مسیحیت ــــــ کا لوگس کے بارے میں تھا۔ معتزلہ کو سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ وہ خدا کے صفات کے بارے میں فلاسفر فیلو کے مقلد تھے اور ایسی صورت میں قرآن کے غیر مخلوق اور ازلی مان لینے میں اُن کے نزدیک عیسائیوں کی تثلیث اور اسلام کی توحید میں کوئی بین فرق نہیں رہ جاتا۔

حقیقت یہ ہے کہ بنی عباس کے زمانے میں کیا اعتقاد اور کیا شریعت سب پر یہودیت اور نصرانیت و مجوسیت کا اس قدر غلبہ تھا اور اس زمانے کے مسلمانوں کو انکی تقلید کا اس قدر ذوق غالب تھا کہ اگر آج ہم اس زمانے کی جمع کردہ احادیث یا اس وقت کے لوگوں کی تفسیر کو غور سے پڑھیں تو اسلام قرآن کی ایک بالکل مسخ صورت اس میں ملتی ہے۔ اس شغف نے کلام الٰہی کے بعض آیات سے ان کو انکار کرایا۔ مثلاً رجم زانیہ کا مسئلہ اور بعض ایسی باتوں کی بحر تادیل کر

ان کو متوجہ کیا جس کی تائید وہ یہودیوں کے نوشتوں سے پاتے تھے جیسے دارالحرب میں سود کا جواز۔ مثال کے طور سے پھر ان محققین کی مبلغ علم و تحقیق کے لئے ایک واقعہ کو لیجئے قرآن شریف نے حضرت ابراہیم کے باپ کا نام آزر بتایا ہے یہودیوں نے ہمارے مفسرین کو سوجھایا کہ یہ صحیح نہیں بلکہ بقول توریت ابراہیم کے باپ کا نام تیراہ تھا۔ جھٹ انھوں نے باپ کی تاویل یوں کر دی کہ عربی میں "اب" چچا کے معنی میں بھی آتا ہے۔ لیکن اگر ان کی تحقیق وسیع ہوتی تو وہ خود یوسبیس (Eusebius) کی تحریر میں آذر ہی کا نام پاتے۔ اور قرآن کی نسبت ان کو غیر صحیح کا گمان نہ ہوتا جس کی وہ تاویل کرنے بیٹھتے۔ اسی طرح میں نے سارے قرآن کو چھان ڈالا ———— اور مجھے تین وقت کی نماز کے علاوہ چوتھے وقت کی نماز کا کہیں کنایۃً بھی ذکر نہیں ملا سمجھ میں نہیں آتا کہ پانچ وقت کی نماز کہاں سے آگئی۔ اس لاطائل قصے کو جبکہ نماز پچاس وقت سے پانچ وقت کی اللہ میاں کے سامنے متعدد عذرداریوں کے ساتھ طے پائی جس میں جناب موسیٰ کے مشورہ کا بہت دخل تھا میرا دل کسی طرح قبول نہ کرتا تھا۔ مگر گولڈزہر (Goldziher) کی جب تحقیق میرے سامنے آئی تو یہ راز کھلا کہ پنجگانہ وقت کی نماز کیونکر مجوس سے لی گئی --- خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ اصل بحث کی طرف رجوع ہوتا ہوں۔

انسان کیوں نبی ماننے کے لئے مکلف ہے۔ ہم پہلے باب میں دکھلا چکے ہیں کہ الہیات اور ایک حد تک اخلاق کا علم انسان کے معمولی سمجھ سے بالاتر ہے۔ ضرور ہے کہ ان باتوں کا کوئی ایسا معلم خدا کی طرف سے مامور ہو جو حکماً ہم کو اس کا معتقد اور پابند بنا دے اور اس کی ذات اتمام حجت کے لئے کافی ہو۔ مگر پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جو علم نبی کو حاصل ہوتا ہے وہ کیوں ہر انسان کو حاصل نہیں ہو سکتا۔ خلاصہ یہ کہ انسانی فطرت میں خدا نے یہ باتیں کیوں نہ پیدا کیں اور ہر شخص کیوں نہ برگزیدہ نبی ہوا۔ یہ مسئلہ خدا کے تقدیر کی ضمن میں آجاتا ہے جس کی ہم آگے چل کر بحث کریں گے۔ مختصراً یوں سمجھ لینا چاہئے کہ انسان کے اجتماعی نظام کے لئے اختلاف ادراک و قوائے و تمیز لازمی امر ہے۔ اگر یہ اختلاف نہ ہو تو دنیا کا کام ایک منٹ نہیں چل سکتا انگریزی کی مشہور کہاوت (When Adam delved and Eve span who was then a gentleman?) وہیں تک کام دیکتی ہے جب تک انسان مدنی الطبع نہیں ہوا، لیکن مدنیت کے ساتھ ہم کو اپنے ملک کی پرانی کہاوت "میں بھی رانی تو بھی رانی کون بھریگا پانی" کی تصدیق کرنا پڑیگی۔ انہیں میں اختلاف طبائع کا بھی سبب ہے کہ ایک انسان حاکم ہوتا ہے دوسرا محکوم ایک معلم ہوتا ہے دوسرا متعلم۔ تو قوائے ذہنیہ و دماغیہ کا اختلاف جب ایک واقعی اور بدیہی امر ہے تو انسانیت کے لئے ایک درجہ نبوت کا ماننے کے لئے کوئی دقت پیش نہیں آتی۔ مگر اس کے ساتھ روسو (Rouseue) کی طرح براہ راست خالق اکبر کو ماننے میں کیا قباحت ہے اگر نبوت کے بغیر خدا شناسی ممکن نہیں تو ضرور ہوا کہ جنھوں نے خدا کو بغیر نبی کے مانا ہے جس میں ارسطو اور فلاطون بھی شامل ہیں وہ در حقیقت خدا کے وجود کو بھی تسلیم نہ کرتے تھے کہ ایسا ان کے لئے ممکن نہیں مگر بہت سے موحدین دنیا میں ایسے گزرے ہیں جن کی تعلیم میں اور ایک نبی کی تعلیم میں بہت ہی باریک فرق الہیات کے بارے میں رہ جاتا ہے۔ نبوت کو ماننے میں خواہ ہم کسی فطرت کا تقاضا اس کو سمجھیں یہ ضرور ہے کہ نبی

کے آنے سے قومیت کی بنیاد پڑ جاتی ہے اور ایک گروہ انسان دوسرے گروہ انسان سے نفرت کرنے لگتا ہے ان کے عادات و معاشرت میں فرق پڑ جاتا ہے اور اس اختلاف سے خانہ جنگی کی نوبت پہونچ جاتی ہے یہ استدلال اگرچہ بظاہر قرین عقل ہے مگر اس میں ایک بڑا دھوکا ہے۔ اور اس دھوکے میں آکر برہمو سماج ہندوستان میں اور ڈائزم یورپ میں کوئی ترقی نہ کر سکا وجہ یہ ہے کہ جہاں تک تخیلات و تصورات کا تعلق ہے وہاں تک تو خدا کو بغیر نبوت کے تسلیم کرنا اتنا مشکل امر ہے مگر عملاً خدا کو ماننا اتنا بڑا راز ہے جس پر کاربند ہونا انسان کے لئے مشکل ہے۔

محض یہ تصور کر لینا کہ اس دنیا کا خالق ایک غیر مفہوم ہستی ہے مذہب کے لئے کافی نہیں وہ خدا پرستی ہے جس پر مذہب کی بنیاد ہے۔ یہ ضرور ہے کہ خدا پرستی کے لئے خدا شناسی شرط ہے مگر فلاسفہ خدا شناسی کو خدا پرستی کی شرط نہیں جانتے اور نہ ان سے یہ ممکن ہوا چنانچہ ہم نے دیکھا ہے کہ باوجودیکہ بعض حکمائے یونان و مصر و بابل و ہند کو الہیات میں خاصہ درک تھا انھوں نے خدا پرستی کا کوئی مسلک نہیں چھوڑا۔ بلکہ وہ اپنی قوم کے ہم مسلک رہے۔

یہی وہ خدا پرستی ہے جسے اسٹوئک فلاسفہ نے الہیات معاشرت سے تعبیر کیا ہے اور ہم اسکی حقیقت باوضاحت مذہب اور اخلاق اور مذہب اور عبادات میں انشاء اللہ بیان کریں گے۔ یہاں پر ہم صرف یہ دکھلانا چاہتے ہیں کہ نبی کا سب سے بڑا کام یہ تھا کہ انسان کے قلب کو اس خلجان سے مطمئن کردے کہ اس کا انجام کیا ہوگا۔ کیونکہ یہ انسان کی فطرت میں داخل ہے کہ وہ اپنی ابتدا اور انتہا پر غور کرے۔ یعنی خدا کے اعتقاد کو انسانی اعمال میں داخل کرے۔ یقیناً اس خیال کو کہ خدا منزہ ازلی اور مکان نور ہے۔ انسان کو کسی نتیجہ پر نہیں پہنچاتا۔ الفاظ و خیالات نہایت ہی ارفع و اعلیٰ ہیں۔ مگر عملی صورت میں سوائے خالی ہاتھ مارنے کے کوئی بات نہیں۔ نبی اس حیثیت سے اس ازلی نور کا ایک فوکس ہے اور فوکس کے وجود کے بغیر جس طرح ہم سائنس کے علم نور کا پورا مطالعہ نہیں کر سکتے۔ اسی طرح نبی کے بغیر خدا کا ادراک ہمیں نہیں ہو سکتا۔ اب صرف سوال یہ باقی رہ جاتا ہے کہ نبی کی شناخت کیا ہے۔ ہم مانتے ہیں کہ یہ سوال سب سے بڑا اہم ہے اور اس کی اہمیت اس وقت اور بھی زیادہ ہو جاتی ہے جبکہ نبوت کا سرچشمہ عرصے سے ہمیشہ بند ہے۔ حتیٰ کہ اگر ایک شخص اس وقت دنیا میں ان تمام معیار پر پورا اترے جو ہم نبی کے لئے ضروری جانتے ہیں بلکہ معجزے پر بھی قدرت حاصل ہو تو ہم اس کو نبی ماننے کے لئے تیار نہ ہوں گے نہ کہ ایسا نبی جس کو ہم صرف روایت سے جانتے ہیں اور کبھی اسکو دیکھا نہیں۔ اور روایت میں واقعیت اور اشتباہ دونوں کی گنجائش ہے جو امتداد زمانہ سے بڑھتی ہی گئی ہیں۔ لامحالہ نبوت کے لئے کوئی اور صورت ہوگی جسکا ثبوت ہر زمانے میں ممکن ہو سکے اور یہ محض اس کا وہ کلام یا پیغام صاف ہوگا جو ہمارے پاس محفوظ ہو۔ ہم اس کتاب میں کسی خاص مذہب کی وکالت کرنا نہیں چاہتے لیکن اگر انسان میں قوت فیصلہ کوئی چیز ہے تو وہ خود اس کتاب پر غور کرنے سے جسکی نسبت دعوائے الہام ہو اس ایک نتیجہ پر ضرور پہنچیگا کہ وہ کس نبی کی کتاب ہے جس کی آواز انسان کو صداقت سے متاثر کر سکتی ہے اور جس کا حامل نبی کہلانے کا واقعی مستحق ہے۔ ایسی ایک کتاب کم سے کم میرے نزدیک دنیا میں موجود ہے جس کی عربی

خود میرا اپنا ایک مشن ہے اور اگر زندگی وصحت و فرصت نے موقع دیا تو اس کو شائقین کے سامنے تنزیل القرآن کے نام سے اسی سلسلہ میں پیش کرونگا۔ انشاء اللہ تعالیٰ آخر میں ایک نظر نبوت کی اس صورت پر ڈالنا ضروری ہے جس کے رو سے جناب مسیح یا بودھ یا کرشن و رام مجسم خدا قرار دئے گئے ہیں۔ ایسی صورت پیدا کرنا انسان کے اس خاص جذبات کا ایک فطری نتیجہ تھا جب اپنی ہستی کو کمزور ترین جانکر خود اپنی اعمال پہ کوئی بھروسہ نہیں رکھتا اور ایک ایسی دستگیری کا محتاج ہے۔ جو اس کو لاچار و بےبس محض پاکر اس کی طرف رحم کا ہاتھ دراز کرے اور اس کو نجات دلائے۔ یا انسان نے ایک نجات دہندہ کی ضرورت اسی وقت محسوس کی ہوگی۔ جبکہ وہ اپنے اعمال دنیاوی کی سزا و جزا کا معترف ہوگا اور جزا کا مقرر ہونا کوئی فطری خیال نہیں ہے۔ بلکہ اس کی تعلیم مذہب ہی نے دی ہے۔ پس نجات دہندہ کی تلاش کا خیال اس کے بعد پیدا ہوا ہوگا جبکہ انسانوں کو نبیوں کی تعلیم مل چکی ہوگی اس میں شک نہیں کہ سزا و جزا کے خیال کے بعد انسان جب اپنے اعمال پر نظر ڈالیگا تو اس کو بہت کم بھروسہ اپنے خود اعمال پر رہ جائیگا کہ انسان نے بدی پر پوری طرح غلبہ اب تک نہیں پایا ہے۔ گو کہ نبوت کی تعلیم نے اس کے سامنے ایسے خدا کا نقشہ ضرور پیش کیا ہے جو رحیم و رحمٰن کی صفت سے موصوف ہے اور جو ہماری توبہ قبول کرتا ہے۔ تاہم اس کی تسلی کے لئے وہ کافی نہیں وہ اسکو ایسی مجسم صورت میں دیکھنا پسند کرتا ہے جس کے آگے وہ رحم کی درخواست بعینہ اسی طرح کر سکے جیسی وہ دنیاوی حاکم کے سامنے کرتا ہے۔ اسی خیال نے مسیح کو الوہیت کا درجہ دیا مگر اس خیال میں ایک بڑا خلل رہجاتا ہے اور وہ یہ کہ اگر ایسا شخص کوئی تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ تو اس کا وجود مقدم و موخر انسانوں کے بارے میں کوئی مفید نتیجہ پیدا نہیں کر سکتا۔ اور اگر وہ تاریخی حیثیت نہیں رکھتا تو حلول کو ماننا محض عبث و وہم ہے لہذا اگر خدا پرستی و نجات کسی صورت سے ممکن ہے تو وہی صورت باقی رہ جاتی ہے کہ ہم ایک برگزیدہ نبی کے کلام کو سنیں اور اسپر ایمان لائیں۔ اور گناہوں سے بچنے کی سعی کریں باقی ہنود کے اوتار کا خیال وہ محض وہم و انسان پرستی ہے۔ کیونکہ وہاں نجات کا مسئلہ سرے سے موجود ہی نہیں

باقی

سید مقبول احمد بی اے

باقی

زنان بازاری

سعید ایک تعلیم یافتہ نوجوان اور ایک بازاری کے جذبات کا مکمل خاکہ انجام اخلاقی پر کیا گیا ہے عمر
شاہد رعنا دہلی کی ایک ڈیرہ دار طوائف کی خود نوشت سوانح عمری ہے کسی کریکٹر پر بنا ہے
جسکے حالات مکر و فریب کی داستان آپ بیتی کی صورت میں عجیب پر لطف ہیں عہ
انجام عیش بدکاری اور آوارگی کے مختلف پہلو قصہ کی صورت میں اس قدر تکمیل کیساتھ دکھائے گئے ہیں کہ کسی دوسری جگہ نظر نہیں آسکتے ہیں سوسائٹی کی اصلاح کے لئے اس کتاب کا مطالعہ نہایت ضروری ہے ۱؍
سعادت - دہلی کی ایک تعلیم یافتہ سلیقہ مند خوبصورت طوائف کے حالات پر روشنی ڈالی گئی ہے اور عاشقانہ خط و کتابت اور وصل و فراق کے کیفیات کو عجیب انداز سے بیان کیا گیا ہے
سزائے عیش - فلسفہ حسن و عشق اور تفریحات عامہ پر عجیب دلچسپ کتاب ہے اس میں ایک شریف گھر اور طوائف کے دن رات کا تقابل کا فرق دکھایا گیا ہے قیمت ۱۰؍
سراب عیش - طوائف سے نکاح کر کے انکو بہو بیٹیوں میں لاکر رکھنے کے نتائج ۱۰؍

منیجر نگار نظیر آباد لکھنؤ

من درچہ خیالیم وفلک درچہ خیال

(بہ سلسلۂ ماسبق)

۶

بدرا کی شادی کو تین ماہ ہو گئے تھے۔ پھاگن کے آخری دن تھے۔ ہر چیز سال گزشتہ کو الوداع کہہ رہی تھی اور ماضیات پر ایک غلط انداز نگاہ ڈال کر کسی خوبصورت اور پُر کیف مستقبل کے لئے اپنے کو آراستہ کرنا چاہتی تھی۔ لیکن احمد کا ماضی اس سے اسی طرح لپٹا ہوا تھا اس کے پاس اگر کوئی چیز تھی تو اس کی حسرتناک داستانِ پارینہ تھی۔ مستقبل اس کے لئے کوئی معنے نہ رکھتا تھا۔ گزشتہ حادثات نے صرف اس کی روح کو افسردہ نہیں کیا تھا۔ اس کا جسم بھی مرجھا چلا تھا جس کی بنا پر مالتی کو تشویش تھی۔

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ چاند اپنی نرم اور صبیح شعاعوں کو سمیٹ کر روپوش ہو چکا تھا۔ چاروں طرف سکوت اور تاریکی کی مشترکہ حکومت تھی۔ آسمان پر بکھرے ہوئے ستارے زمین والوں کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے تھے۔ احمد کی آنکھیں بھی نیند سے محروم تھیں وہ برآمدہ میں اپنے پلنگ پر بیٹھا ہوا اس رات کے سماں پر غور کر رہا تھا اور دل میں کہہ رہا تھا کہ وہ کوئی ایسی ہی رات ہوگی جس نے غالب سے یہ شعر کہلایا۔

کیوں اندھیری ہے شبِ غم ہے بلاؤں کا نزول
آج ادھر ہی کو رہیگا دیدۂ اختر کھلا۔

یہ کہنا مبالغہ نہیں کہ احمد پر واقعی پے بہ پے بلائیں نازل ہو رہی تھیں اور ہر سمت سے اس کو گھیر رہی تھیں۔ پانچ چھ مہینوں سے اس کو تجارت میں بھی خسارہ ہو رہا تھا اور یہ نوبت تھی کہ مہاجن بازار کے کتوں کی طرح ہر طرف اسپر یورش کر رہے تھے اور وہ کسی تقاضہ کو پورا نہ کر سکتا تھا۔ کل قرض کی تعداد پر وہ غور کرتا تھا تو اس کا دم پھولنے لگتا تھا اور اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کس طرح اپنے کو سبکدوش کرے۔ کل ایک ساہوکار اپنے روپئے طلب کرنے آنے والا تھا۔ احمد کو یکایک اس کا خیال آیا اور پلنگ سے اتر کر کبھی برآمدہ میں اور کبھی میدان میں ٹہلنے لگا۔ وہ جب سوچتا تھا تو قرض ادا کرنے کی صرف ایک تدبیر اُسکے ذہن میں آتی تھی اور وہ یہ تھی کہ جو زمینداری بطور باقیات الصالحات کے اس کے پاس ہے اس کو یا تو بیچ ڈالے یا کہیں رہن رکھ دے۔ لیکن کل کی فوری ضرورت کو کیونکر رفع کرے احمد عرصہ سے اس مہاجن کو وعدوں پر ٹال رہا تھا اور اب ٹالنا ممکن نہ تھا۔ اس کو یاد آیا کہ بیگم نے اپنے مویشی کے لئے اس سے مدت ہوئی کچھ بھوسا خریدا تھا جس کی قیمت پچاس روپیہ تھی۔ یہ پچاس روپئے بیگم کے ذمہ ابھی باقی تھے۔ احمد کو اس خیال سے اطمینان ہوا۔ وہ علی الصباح بیگم کے پاس جائیگا۔ اپنے پچاس روپیہ مانگیگا اور اگر موقع ہو تو دو سو اور بطور قرض لیگا تاکہ کل ساہوکار کا مطالبہ ادا کر سکے۔ بیگم اگر

گرد و نواح میں کسی کو مانتی تھی تو وہ احمد تھا۔ وہ احمد کے ساتھ مہربانی اور خلوص سے پیش آتی تھی اور اس سے پہلے بھی اکثر ضرورت کے وقت اس کی مالی امداد کر چکی تھی۔ احمد کو پوری امید تھی کہ بیگم کے پاس اگر روپے ہوئے تو وہ اس کو دینے میں دریغ نہ کرے گی۔ صبح سویرے وہ رسول آباد روانہ ہوگیا۔

بیگم نے دروازہ پر احمد کو بٹھایا اور خود دروازہ کے آڑ سے اس سے باتیں کرنے لگی۔ اس کو احمد کے حال بد کی اطلاع مل چکی تھی اس نے پیار اور ہمدردی سے پوچھا "تم پر کل کتنا قرض ہوگا؟" احمد نے دل میں کہا "یہ اپنا راز ہے۔ کسی دوسرے پر کیوں ظاہر ہو" مگر بیگم کی مترنم آواز ہمدردی اور سچی غمخواری کے جذبات سے لبریز تھی۔ احمد سے یہ نہ ہوسکا کہ وہ اس سے اپنا بھید چھپائے اس نے سچ سچ کہدیا کہ اُس کے قرض کی تعداد معہ سود کے چھ ہزار تھی۔ بیگم کچھ دیر خاموش رہی اس کے بعد کہنے لگی "اچھا تو اسوقت تم ڈھائی سو روپے لے جاؤ میں اس ماہ کے اندر کوشش کرونگی کہ تمہارا کل قرض ادا ہو جائے۔ اس وقت میرے پاس اتنی بڑی رقم موجود نہیں ہے۔ ورنہ فوراً حوالہ کر دیتی۔ لیکن قوی اُمید ہے کہ بہت جلد اس کا کوئی نہ کوئی انتظام ہو جائیگا" احمد حیرت زدہ ہوگیا۔ اس کو معلوم تھا کہ "بیگم" اس کی وقت پر کام آنے والی ہمدرد ہے لیکن یکمشت اتنی بڑی رقم بلا کسی شدید تحریک کے اس کو دیدینے پر تیار ہو جائیگی ایسی حالت میں کہ وہ ادا کرنے کی مقدرت نہیں رکھتا! یہ بات احمد کی سمجھ میں نہ آتی تھی اس نے اسکی اہمیت پر غور کیا تو اس کی غیرت و خودداری کو ٹھیس لگی ـــ اس نے احسانمندی کا اظہار کرتے ہوے کہا "نہیں بیگم صاحبہ۔ اس کی ضرورت نہیں ہے۔ فی الحال مجھکو یہ ڈھائی سو دیدیجئے پھر کوئی نہ کوئی صورت نکل ہی آئیگی" بیگم نے فوراً یہ کہکر احمد کی زبان بند کردی۔ "احمد آج تم نے مجھکو بڑا رنج پہنچایا ہے۔ تم جانتے ہو کہ میں تم کو ہمیشہ اپنا چھوٹا بھائی سمجھتی رہی ہوں۔ دنیا میں میرا کوئی نہیں ہے۔ اس لئے کسی کے ساتھ ایسی محبت ہونا کوئی بعید از قیاس بات نہیں ہے مجھے تمہیں سے محبت ہے اور میں اس محبت کی قائل نہیں جو وقت پر کسی کے کام نہ آئے بچوں کی طرح بیجا خودداری کو راہ نہ دو۔ آخر تم کو مجھ سے روپے لینے میں شرم کیوں معلوم ہوتی ہے؟ جب کبھی خدا تم کو توفیق دے تو مجھکو واپس دیدینا۔ جاؤ ایک مہینہ کے اندر تم کو چھ ہزار روپے مل جائینگے" آج احمد نے محسوس کیا کہ بیگم کے لہجہ میں معمول سے زیادہ درد تھا۔ وہ خاموش ہوگیا۔ بیگم کی خواہش کو وہ رد نہ کرسکا۔ اس نے احمد کو ڈھائی سو روپے لاکر دئے اور چلتے ہوئے کہا "احمد مجھے تم سے ایک ضروری بات کہنا تھی۔ سنا ہے کچھ دنوں سے یہاں کوئی ابو الخیر نامی ڈاکٹر آئے ہیں۔ میں ادھر کچھ دنوں سے بیمار سی رہا کرتی ہوں۔ نہ جانے کیا شکایت ہے۔ تم ذرا ان کو آج شام کو یہاں بھیجدو" "بیگم" کو معلوم تھا کہ ابو الخیر کی شادی حال میں بدور سے ہوئی ہے لیکن وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اس شادی سے احمد کے دل پر کیا گزری ہوگی اس لئے اس نے اس کا ذکر کرکے احمد کی دکھتی ہوئی رگ کو چھیڑنا نہیں چاہا۔

ابو الخیر کے نام سے احمد کے خون میں ایک طوفان برپا ہوگیا۔ اس نے اپنی اصلی حالت کو چھپا کر "بیگم سے کہا" ہاں دیکھئے فوراً جا کر میں ان سے کہدیتا ہوں" یہ کہکر وہ رخصت ہوا۔ راستہ میں وہ سوچتا رہا کہ ابو الخیر کو "بیگم" کا پیغام کیسے پہنچائے۔ ابو الخیر سے ملنا اس کے لئے معمولی آزمائش کا کام نہ تھا۔ خصوصاً جبکہ ابو الخیر قربان علی کے مکان میں رہنے لگا تھا۔ شادی کے

بعد قربان علی کے اصرار سے وہ معہ بدورا کے انہیں کے مکان کے مغربی حصہ میں رہنے لگا تھا۔ اور دواؤں کا مختصر سامان بھی وہیں رکھے ہوئے تھا۔ دوسرے تیسرے دن ماد ہو پور اپنے مکان کی دیکھ بھال کے لئے چلا جاتا تھا۔ احمد کا دل کسی طرح گوارا نہیں کرتا تھا کہ قربان علی کے گھر کی طرف نظر اٹھا کر بھی دیکھے۔ اُس نے اس طرف سے گزرنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ آج اسی لئے وہ رسول آباد بیچ جنگل سے ہوکر گیا تھا۔ اس نے یہ طے کیا تھا کہ کسی آدمی کے ذریعہ ابوالخیر سے "بیگم" کا پیغام کہلا بھیجیگا۔ جب وہ اپنے گاؤں کے قریب پہنچا تو اس نے دیکھا کہ ابوالخیر سڑک پر ٹہل رہا ہے۔ احمد نے پہلے تو نظر بچا کر نکل جانا چاہا۔ لیکن پھر اپنے دل پر جبر کر کے ڈاکٹر کے قریب گیا اور کہا "رسول آباد میں بیگم کی طبیعت کچھ ناساز ہے۔ آپ کو بلایا ہے۔ شام کو جاکر دیکھ آئیے" ابوالخیر بھی احمد کا مواجہ کرنے سے گھبراتا تھا۔ اس نے ایک مصنوعی مسکراہٹ کے ساتھ کہا "میں شام کو ضرور جاؤنگا" اور جلدی سے آگے بڑھ گیا۔

۷

قربان علی نے ابوالخیر کے لئے ہر آسائش کا انتظام کر رہا تھا۔ ان کے مکان کا نصف سے زیادہ حصہ ابوالخیر کے تصرف میں تھا جس کو بدورا نہایت خوش سلیقگی سے آراستہ کئے ہوئے تھی۔ ابوالخیر کی سواری کے لئے قربان علی نے اپنا ایک گھوڑا وقف کر دیا تھا۔ اور ابوالخیر کو خواب میں بھی اس کی امید نہ تھی کہ اتنا جلد اپنی آبائی سرزمین میں خاطر خواہ قدر و منزلت حاصل کر لیگا وہ اپنے کو ہر حیثیت سے خوش نصیب سمجھ رہا تھا۔ بدورا کے ساتھ اس کا انہماک دیکھکر قربان علی کی روح خوش ہو رہی تھی۔ ابوالخیر بدورا کی خوشنودی کی فکر میں ہر وقت رہتا تھا اس لئے کہ بدورا ہی کی بدولت اس کا نصیبہ پھر چمک رہا تھا۔ بدورا بھی شوہر کو اپنی آرزوؤں کے مطابق پا رہی تھی۔ اس کو اگر کوئی شکایت تھی تو یہ کہ ابوالخیر شراب پیتا تھا اور بعض اوقات بدمست ہو جایا کرتا تھا۔ ابوالخیر کی شراب خواری کا علم کسی کو نہ تھا بدورا بھی کچھ دنوں تک اس دھوکہ میں تھی کہ ابوالخیر کوئی دوا روزانہ تیار کرتا ہے آخر کار اس کو اصلیت معلوم ہوگئی اور اس کو اس سے افسوس ہوا لیکن زمانہ نے اس کو ابوالخیر کی اس کمزوری سے مانوس کر دیا۔

احمد کی زبان سے "بیگم" کا نام ابوالخیر نے ایسا محسوس کیا کہ وہ کسی گہرے خواب سے چونک پڑا۔ ابوالخیر کو تعجب ہوا کہ اتنی مدت سے وہ یہاں ہے اور ابتک بیگم سے ملنے کی نوبت نہیں آئی، حالانکہ اس خطہ میں دولت و ثروت اور وقار و مرتبت کے لحاظ سے وہ اس قابل تھی کہ اس سے سب سے پہلے تعارف حاصل کیا جاتا۔ اسی کے ساتھ ساتھ ابوالخیر کو یاد آیا کہ "نصیر کوٹ" کسی زمانہ میں اس کی اپنی ملکیت تھی۔ اس نے ابتک اس کو دیکھا بھی نہ تھا۔ ابوالخیر نے سارا دن ایک عجیب دماغی تلاطم میں گزارا۔ شام ہوتے ہی بدورا سے اتنا کہکر کہ آج "بیگم" کچھ بیمار ہیں۔ مجھکو بلایا ہے میں جا رہا ہوں ممکن ہے آج رات کو زیادہ دیر ہو جائے۔ اپنا گھوڑا کسا اور "نصیر کوٹ" کا راستہ لیا۔ "بیگم" کا نام سنتے ہی بدورا کے دل میں ایک خلش سی پیدا ہوگئی تھی۔ اس کی وجہ شاید یہ رہی ہو کہ "بیگم" کو اس کے باپ سے دشمنی تھی اور وہ نہ جانے کیوں ان کو ہر وقت نقصان پہنچانے کی

فکر میں رہتی تھی۔ بنائے مخاصمت کیا تھی؟ اس کا صحیح علم کسی کو نہ تھا۔ بڑے زمینداروں کی چشمک چونکہ عموماً ایسی ہی ہوا کرتی ہے۔ اس لئے یہ آپس کی دشمنی کوئی حیرت کی بات نہیں تھی لیکن بڑے تعجب کی بات تو یہ تھی کہ بیگم کو احمد کے ساتھ انتہائی خلوص تھا۔ خود قربان علی اس راز کو نہ سمجھ سکتے تھے۔ "بیگم" کہا کرتی تھی کہ احمد مجھکو فرشتوں کی طرح معصوم اور بے ضرر معلوم ہوتا ہے اس لئے اس کی میں دل سے قدر کرتی ہوں"۔

ابو الخیر راستہ بھر عجیب پیچ وتاب میں مبتلا تھا۔ "نصیر کوٹ" کی عمارت جب اس کی نگاہ کے سامنے آئی تو اس کی آنکھیں کھل گئیں اور اس کا خون کھولنے لگا۔ مگر اس کو پھر اس خیال سے یک گونہ اطمینان ہوا کہ یہ عورت اس کے موروثی اموال پر قابض ہونے کے باوجود جان کی خیر کے لئے اس کی ایک حد تک محتاج ہے۔ ابو الخیر کو اس کا غرور ہونے لگا اور اس نے غرور سے اپنے سر کو بلند کر ایک خاص انداز سے جنبش دی۔

"نصیر کوٹ" ایک چھوٹا سا محل تھا جو چہار دیواری سے گھرا ہوا تھا۔ چہار دیواری کے اندر مکان کے اردگرد ہر قسم کے پھول اور درخت لگے تھے۔ بیگم اتنی بڑی عمارت میں صرف دو تین ماماؤں کے ساتھ رہتی تھی۔ پہرہ دار اور مرد خدمتگار جتنے تھے وہ چہار دیواری کے باہر اس قطعہ میں رہتے جو انھیں کے لئے اُتر جانب تعمیر کرایا گیا تھا۔

جسوقت ابو الخیر ایک ماما کی رہنمائی میں چہار دیواری کے اندر داخل ہوا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی ساحر کی قلمرو میں پہنچ گیا ہے۔ گونہ گوں رنگ و بو کی ایک دنیا بنا ہوا تھا۔ ابو الخیر کے حواس مسحور ہو رہے تھے تھوڑی دیر کے لئے وہ یہ بھی بھول گیا کہ وہ کس سے یہاں آیا ہے۔ صحن میں ایک چبوترہ تھا۔ ماما نے ڈاکٹر کو وہیں بٹھایا اور خود بیگم کو اطلاع دینے گئی۔ برآمدہ میں ایک پردہ ڈالا گیا۔ ایک طرف بیگم بیٹھی اور دوسری طرف ابو الخیر کو بلا کر بٹھایا۔ بیگم نے ماما کو کسی کام سے رخصت کر دیا۔ ماما شبہ کی نگاہیں ڈالتی ہوئی چلی گئی۔ بیگم نے پردہ سے اپنی سرخ و سفید گول کلائی نکال کر کہا "ڈاکٹر صاحب دیکھئے تو مجھے کیا ہوا۔ میرا دل ہر وقت دھڑکا کرتا ہے اور طبیعت سست اور مضمحل رہا کرتی ہے دو ایک روز سے بخار بھی معلوم ہوتا ہے" ابو الخیر پہلے تو کلائی کی دلربائی میں کچھ ایسا محو ہوا کہ "بیگم" نے جو کچھ کہا اُس کو سُن بھی نہ سکا اس نے کہا "ہاں تو آپ کو کیا شکایت ہے؟" بیگم نے دوبارہ اپنا حال بیان کیا۔ ابو الخیر توجہ سے نبض دیکھنے لگا اور بڑی دیر تک دیکھتا رہا نبض سریع ضرور تھی مگر بخار کی نہ تھی اس نے مسکرا کر کہا "بیگم صاحبہ آپ کو بخار تو ہے نہیں۔ یہ صرف آپ کا وہم ہے اور وہم نہ جانے کتنی بیماریاں پیدا کر سکتا ہے۔ اچھا اب آپ ذرا لیٹ جائیے۔ میں پردہ کے باہر سے آلہ لگا کر آپ کے پھیپھڑے وغیرہ دیکھنا چاہتا ہوں" بیگم نے اس کے کہنے پر عمل کیا۔ ابو الخیر نے دیکھا تو بیگم کا دل واقعی اچھل رہا تھا۔ ابو الخیر گھبرا کر پوچھنے لگا "کتنے دنوں سے آپ کا یہ حال ہے؟" بیگم نے جواب دیا کوئی سات برس سے۔ ابو الخیر نے جواب دیا "خیر آپ کو میں دوائیں بھیج دونگا۔ حسب ہدایات استعمال کیجئیگا۔ آپ کا مرض مہلک نہیں ہے۔ پریشان کرنے والا ضرور ہے۔ اس بیماری کو "ہسٹیریا" کہتے ہیں" "یہ کیا بلا ہے؟" بیگم نے دریافت کیا۔ اس کے لہجہ میں ایک تلخ تمسخر تھا۔ ابو الخیر کو اب خیال ہوا کہ یہاں اس کی اصطلاحوں کا

سمجھنے والا کوئی نہیں ہے۔ اس نے فوراً جواب دیا یہ وہی چیز ہے جسکو عوام "باؤ گولہ" کہتے ہیں اور جسکو ایک قسم کا ہول دل سمجھنا چاہئے"۔ پردہ کی آڑ سے چند منٹ تک کوئی آواز نہیں آئی۔ اس کے بعد "بیگم" نے پوچھا "ہاں تو ڈاکٹر صاحب آپ کو اپنی تشخیص پر پورا اعتماد ہے؟"۔ اس کی آواز میں وہی طنز تھا۔ ابوالخیر نے متحیر ہو کر کہا "بیگم صاحبہ میں آپ کے سوال کا مطلب نہیں سمجھا" بیگم نے جواب دیا "کچھ نہیں۔ یونہی پوچھ لیا۔ اس کا علم تو آپ کو بھی ہے کہ میں وہمی ہوں جیسا کہ آپنے ابھی کہا تھا۔ ایک وہمی کی بات کا خیال نہ کیجئے۔ اور اگر کوئی گستاخی ہوئی ہو تو معاف کیجئے"۔ جملہ پورا ختم بھی نہ ہونے پایا تھا کہ پردہ ایک زور کے جھٹکے کے ساتھ ہٹا اور ایک لطیف و نازک پیکر ابوالخیر کے سامنے تھا جو شمع کی مدہم روشنی میں صرف ایک خیالی تمثال معلوم ہوتا تھا ابوالخیر نے ایسا محسوس کیا کہ دفعتاً وہ کسی خواب کی دنیا میں منتقل کر دیا گیا ہے۔ وہ نہ جانے کب تک اسی عالم میں رہتا اگر "بیگم" کے منہ سے الفاظ اس کے حواس یکجا نہ کر دیتے "ہاں یہ تو سچ ہے کہ مجھکو ہول دل ہے مگر شاید آپ اسکی علت نہیں سمجھ سکے ہیں۔ کچھ یاد ہے ڈاکٹر صاحب۔ ہم نے ایک دوسرے کو کتنی مدت کے بعد دیکھا ہے؟"

ابوالخیر چونک پڑا اور اس کی زبان سے بیساختہ نکل گیا "کون؟ عائشہ؟"۔ عائشہ کے ہونٹوں پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔ عائشہ نے کہا "ہاں خوب پہچان لیجئے۔ کہیں دھوکا نہ ہو"۔ اتنا کہنے کے بعد اس کے اعصاب میں جو غیر معمولی تناؤ تھا وہ ڈھیلا پڑ گیا وہ تھر تھرا کر اس تخت پر بیٹھ گئی جسپر ابوالخیر بیٹھا ہوا تھا۔ عائشہ نے سر تھام کر ابوالخیر پر نگاہیں جما کر کہنا شروع کیا۔ میاں اللہ میں تمہارے پیچھے کس طرح مٹی۔ اتنی مدت تک کیسی کیسی روحانی صعوبتوں میں مبتلا رہی۔ اور تم مجھے خراب و خستہ کر کے دنیا میں کامیاب بنے پھرتے ہو۔ آخر جزا و سزا کا مالک تم کو اس بیدردی کا اجر کیوں نہیں دیتا۔ میں معصوم تھی۔ بیگناہ تھی۔ دنیا کے بھلے برے کی مجھکو کچھ خبر نہ تھی۔ تم نے میری ناتجربہ کاری سے غلط فائدہ اٹھایا۔ ابلیس نے آدم کو بھی اس طرح نہیں بہکایا ہوگا جس طرح تم نے مجھکو بہکایا اور اس کا خمیازہ اٹھانے کے لئے مجھے تنہا چھوڑ دیا۔ تمہارے چلے جانے کے بعد دہلی میرے لئے نمرود کے پہاڑ سے کم نہ تھی۔ میرا خیال تھا کہ تم کو اس کا احساس ہوگا اور بہت ممکن ہے کہ تم بھی میری جدائی میں گھل رہے ہو۔ مگر نہیں تم تو جیسے تھے ویسے ہو بلکہ اب زیادہ آسودہ اور خوش نصیب ہو۔ سچ ہے اپنے کو مٹا دینا عورت ہی کا کام ہے۔ میں افسانوں میں مرد کی بیوفائی کے کارنامے پڑھا کرتی تھی لیکن جب تک خود مجھکو تجربہ نہ ہوا تھا میں اُن کو صرف افتراپردازی سمجھتی رہی۔ ابوالخیر میں اپنی انتہائی بیزاری میں تم کو کوسنے دیتی رہی ہوں جسکے تم مستحق بھی تھے۔ مگر ذرا میری بدقسمتی دیکھنا کہ تم کو ایک لمحہ کے لئے بھی خاطر انداز نہیں کر سکی ہوں۔ تم مجھکو بھول گئے مگر میں تم کو نہ بھول سکی۔ تم کو مجھ سے معمولی لگاؤ بھی نہ تھا مگر مجھکو تم سے عشق تھا جو کسی کے مٹائے نہ مٹ سکا اور جس نے میری ساری زندگی کو دردناک بنا کر رکھ دیا۔ میں نے عہد کیا تھا کہ اگر خدا نے مجھکو تم پر قدرت دی تو اپنا انتقام ضرور لونگی۔ لیکن یہ صورت دیکھکر جسکے ساتھ ہاں مجھے اب بھی الفت کا دعویٰ ہے میں اپنے عہد پر قائم نہیں رہ سکتی۔

ابوالخیر مجھکو اپنی خامکاری کا صحیح اندازہ نہیں تھا۔ آج تم میرے سامنے ہو میں تم کو زندہ دفن کرا سکتی ہوں مجھے انجام کی مطلق پروانہ تھی۔ پرسوں تم تحصیلدار صاحب کے ہاں گئے تھے۔ میں بھی ان کی بیوی سے ملنے گئی تھی۔ میں اکثر وہاں جایا کرتی ہوں۔ میں نے

تم کو وہیں جنگلے سے دیکھا اور مجھکو معلوم ہوا کہ جس ڈاکٹر کا ایسا شہرہ ہے وہ وہی شخص ہے جس نے مجھکو زندہ در گور کر رکھا ہے اسوقت سے میری کمزوری نے پھر مجھ پر قابو پانا شروع کیا اور آج یہ حالت ہے کہ تم کو ملامت بھی نہیں کر سکتی۔ میں پھر تمہارے بس میں ہوں میری دبی ہوئی آرزوئیں پھر اُبھر رہی ہیں اور میں تم سے پھر قرب چاہتی ہوں یا خدا میں کیا کروں! اب تم اس قابل ہی نہیں رہے کہ اپنی ظلم کی تلافی کر سکوں اور پھر تم کو بدو دال گئی ہے تم کو اس کی ضرورت ہی کیا۔"

عائشہ اپنے منہ کو ہاتھوں سے ڈھانپ کر رونے لگی۔ ابو الخیر ابتک مجرم بنا ہوا سب کچھ سنتا رہا۔ عائشہ کے الفاظ کا طوفان فرو ہوا تو اُس نے اپنے کھوئے ہوئے حواس مجتمع کئے اور عائشہ کے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہنے لگا "اس میں شک نہیں کہ میں ایک جہنمی گنہگار ہوں۔ میری ہمت نہیں کہ میں اپنی بریت میں کچھ کہوں مگر میں اتنا بیدرد اور جذباتِ لطیف سے بیگانہ نہیں ہوں جتنا کہ تم نے سمجھ لیا ہے۔ دہلی میں تمہارے عزیز و اقارب میرے جانی دشمن ہو گئے تھے۔ میرا وہاں کوئی اپنا نہ تھا۔ مجھ سے یہ کمزوری ضرور ہوئی کہ تم کو چھوڑ کر اور اپنی جان لیکر بھاگ کھڑا ہوا سو اس کی جو سزا چاہو دے لو مگر للہ یہ نہ سمجھو کہ تم سے مجھکو محبت نہ تھی یا میں تم کو محض فریب دینا چاہتا تھا۔ میں نے تمہاری فکر میں نہ جانے کتنی راتیں سفید کر ڈالی ہیں۔" یہ سب جھوٹ تھا۔ ابو الخیر کو عائشہ شاید یاد بھی نہ تھی۔

عائشہ نے پھر کہنا شروع کیا "خیر اس کا صحیح علم تم کو اور تمہارے خدا کو ہوگا۔ لیکن اب مجھے بتاؤ کہ میں کیا کروں۔ میں اب تم سے اس قدر نزدیک ہوتے ہوئے تم سے دوری گوارا نہیں کر سکتی یہ نہ سمجھنا کہ مجھکو از سر نو تمہارا سودا ہوا ہے یہ سودا آجتک میرے سر سے گیا ہی نہیں۔ اتنی دولت پانے کے بعد بھی میں نے جینے کا مزہ نہیں اٹھایا اور نہ اب اس کی اُمید ہے۔ تم مجھے دہلی میں رسوا کر کے چلے گئے تھے۔ میں بد تماش مشہور ہو گئی تھی۔ کہیں سے میری نسبت نہیں آتی تھی۔ میرا شوہر (نصیر خاں) تجارت کے سلسلے سے سیاحت کیا کرتا تھا جب وہ دہلی جاتا تھا تو میرے باپ کے وہاں ٹھیرتا تھا۔ میرے باپ سے اُس سے دیرینہ راہ و رسم تھی۔ باپ نے اس سے میری سرگزشت بیان کر دی۔ اس کی عمر پچاس سال کی تھی۔ اس وقت جبکہ میں ۲۱ سال کی تھی۔ اس کی بیوی کو عرصہ ہو گیا تھا۔ اس کے گھر کا کوئی دیکھنے والا نہ تھا۔ وہ مجھ سے شادی کرنے کے لئے طیار ہو گیا۔ باپ نے مجھے اس تسمہ پا کے سپرد کر دیا۔ اگر میں تمہاری محبت کا چور دل میں نہ بھی لئے ہوتی تو بھی مجھ میں اور میرے شوہر میں عمر کے لحاظ سے اتنا فرق تھا کہ کم از کم میرے مزاج و طبیعت کی عورت نباہ نہیں سکتی۔ نتیجہ جو ہونا چاہیے تھا وہ ہوا مجھے خفقان سا رہنے لگا۔ آج تم بھی ہول دل تشخیص کرتے ہو۔ ۴ برس ہوئے کہ میرا شوہر مر گیا اور میں تنہا رہ گئی۔ میرے ایک لڑکا بھی تھا جو سال بھر کا ہو کر مر گیا۔

عائشہ کی داستان عبرت انگیز تھی۔ ابو الخیر نے اس کے رخسارہ کو بوسہ دیکر کہا "میں نے تم کو برباد کر دیا۔ اب بتاؤ کیا کرنا چاہیے۔ تم جو کہو میں اس کے لئے حاضر ہوں۔"

عائشہ نے ایک ٹھنڈی سانس لیکر کہا "اب نہ زیادہ کچھ کہا جا سکتا ہے اور نہ کیا جا سکتا ہے تم تو ایک پری جمال پڑھی لکھی بیوی

ملی ہے۔ تم کو اب اس کا خیال رکھنا ہے۔ سنا ہے بدورا نے اعلیٰ معیار کی تعلیم و تربیت پائی ہے۔ آہ میرے باپ نے مجھکو بھی بڑے ارماں سے پڑھایا لکھایا تھا مگر میرا یہ حشر ہونا تھا۔ میں خدا گواہ ہے یہ ہرگز نہیں چاہتی کہ تم کو بدورا سے چھین کر اپنا کر لوں۔ میری زندگی تو خراب ہو ہی چکی۔ خواہ مخواہ کسی کی بنی بنائی زندگی کیوں بگاڑوں۔ مجھکو بدورا سے جلنے کی کوئی وجہ نہیں اگرچہ اس کے باپ سے مجھے پوری دشمنی ہے۔ وہ خاندانی خود غرضی ہے۔ بہر حال یہ ضرور چاہتی ہوں کہ تم کبھی کبھی آ کر میری بات پوچھ لیا کرو۔ ابوالخیر تم نے مجھکو کہیں کا نہ رکھا۔ اب کم از کم میری یہ تمنا تو پوری کرو اور میرے دکھتے ہوئے دل پر ہاتھ دہرو۔ اس سے زندگی کے باقی ماندہ دن سکون سے کٹ سکینگے۔ وعدہ کرو کہ مجھے پھر دہوکہ نہیں دوگے۔" عائشہ کی رگوں میں ایک طوفان پھر برپا ہو چلا تھا۔

ابوالخیر نے کہا "یہی نہیں عائشہ ملکہ جہاں تک ممکن ہوگا میں تمہاری ہر خواہش کو پوری کرونگا اور جو ظلم تم پر ہوا ہے اس کی تلافی کرونگا۔"

"نہیں بس مجھے اس سے زیادہ کی ہوس نہیں کہ تم میرے پاس آجایا کرو اور میرا جی بہلا جایا کرو۔ اچھا اب رات زیادہ ہو چکی ہے بدورا انتظار کرتی ہوگی۔ یہ روپے لو اور اب جاؤ۔ روپے میں اس لئے دیتی ہوں کہ گھر جاؤ تو ممکن ہے تمہاری فیس کے بارے تم سے سوال ہو" عائشہ نے پچاس روپے ابوالخیر کو دئے۔ ابوالخیر نے سوچ سمجھکر لے لیا اور رخصت ہوا۔ عائشہ بڑی حسرت سے اس کو دیکھتی رہی اور چلتے چلتے کہا "کل پھر اسی وقت آنا۔ میں ابھی بیمار ہوں" یہ کہکر وہ ہنس دی اور اسکی ہنسی میں درد تھا اس دن رات کو ماماؤں میں بڑی دیر تک سرگوشیاں ہوتی رہیں۔

ابوالخیر تمام رات طرح طرح کے خیالات میں الجھا رہا "بیگم" نے ایک بالکل نئی دنیا اس کے پیش نظر کر دی تھی جو اس کی موجودہ دنیا سے کہیں بڑھکر پر شکوہ تھی مگر جسمیں وہ داخل نہ ہو سکتا تھا۔ گھر پہنچکر اس نے بدورا سے بہت کم باتیں کی۔ بدورا نے تیور سے اس کو پریشان پایا اور خود فکر میں پڑ گئی۔ رات بھر وہ بستر پر بیچین رہی۔ ابوالخیر کی پچھلے پہر آنکھ لگ گئی اور وہ خواب میں کہہ رہا تھا "میں نے شادی میں بڑی عجلت کی۔ کاش تین مہینہ اور مجبور رہتا" بدورا نے سن لیا اور ایسا محسوس کیا کہ خلاف توقع کوئی وزنی چیز آکر اس کے دل سے ٹکرا گئی۔

۸

انسان کو عموماً اپنی طبیعت کا غلط اندازہ ہوتا ہے یہ بھی قدرت کا ایک غمزہ ہے کہ آپ سے ایک ارادہ کرا کے خود اسکے توڑنے کے درپے ہو جاتی ہے۔ عائشہ کی طبیعت پھر اس کو دہوکہ دے رہی تھی۔ اس نے ابوالخیر سے بلا سوچے سمجھے یہ کہا تھا کہ "مجھے اس سے زیادہ کی ہوس نہیں کہ تم میرے پاس آجایا کرو" اس کی ہوس ایک دل باختہ و جاں باختہ عورت کی ہوس تھی۔ اس سے انکار نہیں کہ وہ نہ دل سے چاہتی تھی کہ بدورا اس کے ہاتھوں خراب نہ ہو لیکن بہ قول حسرت "تجدید آرزو" محبت کی شورشوں کو ہمیشہ تیز کر دیتی ہے۔ ابوالخیر بلا ناغہ عائشہ سے ملنے لگا تھا۔ عائشہ اس کی غیبت میں برابر یہ تہیہ کرتی تھی کہ ابوالخیر کو بدورا سے چھیننے کی کوئی سست سے سست بھی کوشش نہیں کریگی۔ لیکن جس وقت ابوالخیر سامنے ہوتا اس وقت

عائشہ اپنے آپے میں نہیں رہتی تھی۔ آخر کار اس کے دل میں یہ خیال بیٹھ گیا کہ اس کو ابوالخیر پر بدور اسے زیادہ حق ہے اور اگر وہ پھر ابوالخیر سے رسم و محبت بڑھا کر اس کو اپنا گرویدہ بنالے تو کوئی گناہ نہ ہوگا۔ اب عائشہ صرف ایک "حریف بادہ پیما" کی حیثیت سے رہنا نہیں چاہتی تھی بلکہ ابوالخیر کی "حبیب" بنکر ہر وقت اس کے ساتھ نشست و برخاست کا حق حاصل کرنا چاہتی تھی۔

ابوالخیر بدور سے شادی کرنے پر پچھتانے لگا تھا۔ یہ خیال اس پر مستولی ہو رہا تھا کہ اگر آٹھ دس ماہ قبل عائشہ سے ملاقات ہوگئی ہوتی تو آج نہ صرف اپنی لٹی ہوئی دولت پر وہ ازسر نو قابض ہوتا بلکہ اس کے ایک گناہ کا ازالہ بھی ہو جاتا۔ اُس کو عائشہ کے یہاں آتے جاتے چار مہینے ہوگئے تھے۔ بدور سے اس کی بے اعتنائی بڑھ رہی تھی۔ بلکہ اب بات بات پر وہ بدور سے لڑ بیٹھتا تھا۔ بدور سب کچھ دیکھتی تھی اور سمجھتی تھی مگر منہ سے اُف نہ کرتی تھی وہ ان عورتوں میں سے نہ تھی جو اپنے رنج و ملال کو ظاہر کرکے اپنے کو کمزور ثابت کر دیتی ہیں۔ دھیرے دھیرے اس کو یقین ہو چلا تھا کہ اس کے باپ نے اور ایک حد تک خود اس نے بھی احمد کی جو دل آزاری کی ہے اس کی سزا قسمت میں لکھی ہوئی ہے۔ احمد کی گرتی ہوئی حالت سے وہ بے خبر نہ تھی اور اس کا ذمہ دار اپنے آپ کو سمجھتی تھی۔ اس کو اگر کسی خیال سے تسکین تھی بھی تو وہ احمد کے ساتھ مالتی کی شفتگی تھی۔ بدور مالتی سے جلنے کا کوئی حق تو رکھتی نہ تھی۔ لہذا ضمیر کو صاف رکھنے کیلئے اپنے کو یہ دھوکہ دے رہی تھی کہ احمد بھی مالتی کے ساتھ منہمک ہوگا اور اپنی پچھلی محبت کو بھولنے کی کوشش کرتا ہوگا۔ اگر یہ نہ ہوتا تو اب جبکہ اتنا جلد اسکی متاہل زندگی بدمزگیاں شروع ہوگئی تھیں بدور کی المناکیوں کی کوئی انتہا نہ ہوتی۔ اس کا یہ خیال کہ احمد مالتی کو چاہتا ہے اس وجہ سے اور بھی راسخ ہوگیا تھا کہ احمد نے حال میں اپنا قرض ادا کرنے کے بعد اپنی ساری جائداد مع مکان مالتی کے نام لکھدی تھی۔ لوگوں نے اس کی اس حرکت کو فتور عقل کا نتیجہ سمجھا تھا۔ اس لئے کہ احمد نے مالتی کے ساتھ نکاح نہیں کیا تھا۔ مالتی اس کے ساتھ رہتی ضرور تھی اور اس کی ہر خدمت بیوی کی طرح انجام دیتی تھی مگر احمد نے ابتک اس سے شادی کرنے کا نام بھی نہیں لیا تھا۔ اس کا سکوت و اضمحلال بڑھ رہا تھا اور وہ اپنے کو اس لائق نہ سمجھتا تھا کہ کسی کو اپنا پابند بنالے۔ لیکن بدور ابھی سمجھ رہی تھی یا سمجھنا چاہتی تھی کہ احمد مالتی کو اپنی بیوی بنانا چاہتا ہے۔ بہر صورت آج کل احمد اس کو بری طرح یاد آرہا تھا اور اس کی اپنی زندگی نے جو رنگ بدلنا شروع کیا تھا وہ بدور کو احمد کی یاد دلائے بغیر رہ بھی نہ سکتا تھا۔

ابوالخیر اور عائشہ کا قصہ شہر ہو چکا تھا۔ قربان علی پہلے سے ابوالخیر سے مایوس ہو رہے تھے اس لئے کہ ابوالخیر اس وقت بھی جبکہ وہ بدور پر اپنی تمامتر توجہ وقف کئے ہوئے تھا۔ قربان علی سے بیگانگی اور اجنبیت ہی کا برتاؤ کرتا رہا۔ وہ اُنکے پاس بہت کم اُٹھتا بیٹھتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ بدور کے سوا کسی سے ربط و ضبط رکھنا نہیں چاہتا۔ ابوالخیر کی نئی رفتار نے قربان علی کو اس کی صورت سے بیزار کر دیا۔ اسی کے ساتھ وہ یہ سمجھنے لگے کہ بیٹی کی زندگی خود انھوں نے مٹی میں ملائی ہے جو کچھ ہو رہا ہے اُن کے اپنے اعمال کی سزا ہے۔ احمد کے ساتھ جو دغابازی کی گئی ہے اس کا دل جس طرح توڑا گیا ہے اسی کا پھل اُن کو مل رہا ہے۔ زندگی کو بیدل نے "روز جزا" بتایا ہے آج اگر قربان علی سے کوئی پوچھتا تو وہ کہدیتے "ہاں میرا بھی یہی

خیال ہے۔"

۹

مالتی بڑے صبر و استقلال کے ساتھ احمد کی خدمت کر رہی تھی اور اس گھڑی کا انتظار کر رہی تھی جبکہ وقت احمد کی غمناکی کو دور کر دے گا اور وہ دنیوی رسوم و قیود کی رو سے بھی اس کا اپنا ہو جائیگا۔ مالتی اسی اُمید کے سہارے جی رہی تھی۔ جی ہی نہیں رہی تھی بلکہ خوش آئند مستقبل کے خیال سے اس کی موجودہ زندگی بھی پُرسرور تھی۔ احمد بیمار رہنے لگا تھا۔ کوئی مہینہ ایسا نہ گزرتا تھا جس میں وہ پانچ چھ روز کے لئے پابند بستر نہ ہو جاتا ہو۔ مالتی اس کو اپنا سرتاج سمجھکر اس کی تیمارداری کرتی تھی۔ احمد کو کبھی اس سے راحت نہ ملتی تھی۔ وہ دل میں چور لئے ہوئے تھا۔ مالتی کی جانفشانیاں وہ دیکھتا تھا۔ اس کی عاشقانہ خود فراموشی کا وہ معترف تھا۔ اسپر اسکا دل روتا تھا۔ لیکن آخر اس کا کیا علاج کہ مالتی کی صورت سے بھی اس کے اندر وہ جذبات برانگیختہ نہ ہوتے تھے جو بدورا کے نام سے اس کے دل میں ایک ہلچل مچا دیتے تھے۔ احمد کو امید تھی کہ وہ اپنی پچھلی زندگی اور اسکی محرومیوں کو بھول سکیگا۔ اسی بنا پر اس نے وقتی تاثرات سے مغلوب ہو کر مالتی سے ایسے وعدے کر لئے تھے جن کا پورا کرنا اس کے اختیار سے باہر تھا۔ لیکن وقت نے بہت جلد بتا دیا کہ اسکی یہ اُمید محض ایک فریب ہے جس کی اگر کوئی اصلیت ہو سکتی ہے تو وہ بس اسقدر ہے کہ اس کو مالتی پر رحم آ رہا ہے۔ مگر رحم اور محبت میں کوئی ربط نہیں۔ احمد پر رفتہ رفتہ یہ حقیقت کھل رہی تھی۔ وہ بدورا سے ناامید ہو چکا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ بدورا سے اب کوئی تمنا وابستہ رکھنا ایسا ہی بے معنے ہے جیسا کہ بڑھاپے میں کسی کا جوانی کے لئے بیقرار ہونا۔ مگر وہ محبت اور اس کے "رسم تقاضہ" سے مجبور تھا۔ دنیا اور دنیا کی ہر چیز سے اس کی طبیعت ہٹ گئی تھی جینے سے اس کا دل بیزار تھا۔ زندگی میں اس کا کوئی حوصلہ نہ تھا۔ لیکن بدورا اور بدورا کی محبت سے غفلت اور بیگانگی برتنے میں وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ بڑے سے بڑے تیاگی اور تارک الدہر کو دیکھا گیا ہے کہ وہ کسی ایک چیز سے ان کو ایسی لاگ ہوجاتی ہے کہ سارا تیاگ بھول جاتے ہیں۔ احمد کو بھی اسی گروہ کا ایک فرد سمجھنا چاہیئے۔

احمد کو اپنی طبیعت پر اعتبار نہیں رہا تھا۔ وہ اب اس بلند آہنگی کے ساتھ مالتی سے یہ نہ کہہ سکتا تھا۔ "آج سے تم مجھکو اپنا سمجھو۔" یہ سچ تھا کہ مالتی کے سوا اب احمد کا دنیا میں کوئی نہ تھا مگر خود احمد کسی اور کا تھا۔ بظاہر گو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب وہ کسی کا بھی نہیں۔

احمد کی دل ریشی اور شکستہ خاطری روز بروز نہیں لمحہ بہ لمحہ بڑھ رہی تھی۔ وہ ہر وقت تڑپا کرتا تھا۔ مالتی دیکھ دیکھکر دل ہی دل میں کڑھتی تھی۔ وہ خوب سمجھتی تھی کہ یہ بدورا کا جنون ہی جو احمد کو دم بھر کے لئے چین نہیں لینے دیتا اور جو اس کی صحت جسمانی کو بھی غارت کرتا چلا جاتا ہے لیکن مالتی منہ سے کچھ کہتی نہ تھی اس لئے کہ احمد اپنی ناگفتہ بہ حالت کو اس سے چھپائے ہوئے تھا۔ احمد یہ جانتا تھا کہ اب مالتی کا اپنی برادری والوں میں جا ملنا ہی ممکن نہیں۔ اسی لئے اس نے اپنی زمینداری اس کے نام منتقل کر دی تھی اور مطمئن تھا کہ کم از کم اب مالتی کسی کی محتاج نہیں رہیگی۔

بدورا کی مصیبتوں کی خبر اس کو ملی تو احمد کی اندوہگینی کی انتہا نہ رہی اور اب اس کے دل میں ایک تازہ کھٹک پیدا ہو گئی تھی۔ سب سے زیادہ روح فرسا اس کے لئے یہ خیال تھا کہ قربان علی اور بدورا پشیمان ہوں گے اور ان کی پشیمانی کو چونکہ اس کی اپنی ذات سے بھی تعلق تھا اس لئے وہ اور بھی بیچین تھا۔ قربان علی اس درمیان میں ایک بار اس سے ملے تھے۔ اور اُس نے ایک ناقابلِ اظہار سراسیمگی محسوس کی تھی۔ قربان علی نے بغیر کسی قسم کی تمہید کے کہا تھا۔ احمد آج تقریباً آٹھ نو مہینہ کی مدت ہو گئی ہو کہ ہمنے ایک دوسرے کی صورت نہیں دیکھی۔ میں اس قابل ہرگز نہیں کہ تم سے شکایت کروں۔ تم جس قدر کشیدگی اور برگشتگی کا اظہار مجھ سے کرو بجا ہے۔ لیکن خدا کے لئے میرے بڑھاپے پر رحم کرو۔ میرے پاس یونہی رونے اور سر پیٹنے کے لئے ضرورت سے زیادہ سامان موجود ہے۔ تم نے اگر اپنی بیگانگی اور غیرت کا برتاؤ قائم رکھا تو میرا دل اور بھی بیٹھ جائیگا اگر میرے خیال سے نہیں تو بدورا کی محبت کا پاس کرو اور میری خطاؤں کو معاف کر کے اس کا دل ہاتھ میں لو۔ وہ روز بروز اپنے غم میں تحلیل ہو رہی ہے۔"

احمد کے اعصاب میں قربان علی کے حسرت میں ڈوبے ہوئے ہوئے الفاظ نے ایک تشنج پیدا کر دیا تھا اس نے بڑے ضبط سے کام لیا اور جواب دیا "چچا آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں۔ میرے زخموں پر نمک نہ چھڑکیے جو ہونا تھا وہ ہوا۔ اور جو ہو گیا اُس کا تدارک محال ہے۔ لیکن یہ صرف آپ کا وہم ہے کہ میں آپ لوگوں کی طرف سے کدورت دل میں لئے ہوں۔ بدورا میرے لئے اب بھی وہی ہے جو پہلے تھی البتہ میری زندگی میں کچھ ایسے ناہموار واقعات ہوتے رہے ہیں جنھوں نے مجھکو سرد دل بنا کر رکھ دیا ہے اور میری روپوشی کی یہی وجہ تھی۔" احمد نے قربان علی کی مروت اور ہمدردی میں یہ غلط بیانی کی اور پھر پچھتانے لگا۔ قربان علی نے چلتے چلتے وعدہ لے لیا تھا کہ اب وہ روز ان کے گھر آیا کرے گا۔ احمد نے وعدہ کر دیا تھا مگر بدورا کا سامنا کرنے میں وہ پس و پیش کر رہا تھا۔ بدورا نے ادھر اس کو کئی خط بھیجے تھے اور اس نے کسی کا جواب نہیں دیا تھا۔ بدورا نے اس کو پہلی محبت کا واسطہ دلایا تھا اور ہاتھ جوڑ کر اس کو بلایا تھا مگر احمد جانے کی ہمت نہ کر سکا تھا۔

بدورا کا جو پہلا خط احمد کو ملا تھا مطالعہ کے قابل ہے اس لئے کہ وہ بدورا کے ہیجان و اضطراب کا آئینہ ہے۔ اس کی نقل یہ ہے:

پیارے احمد۔

نہ جانے اب مجھکو تمہیں اس لقب سے یاد کرنے کا حق حاصل ہے یا نہیں۔ اگر نہیں تو میری اس بے حیائی سے درگزر کر دو۔ تم مجھ سے عمر میں پانچ برس بڑے ہو اور رسماً مجھے تم کو بھائی کہکر خط میں مخاطب کرنا چاہئے لیکن تم جانتے ہو کہ بچپن سے تم نے میری یہ عادت نہیں پڑنے دی۔ میں "احمد" "پیارے احمد" کہکر پکارتی رہی ہوں اور اب بھی پکارونگی چاہے تم مخاطب ہو یا نہ ہو۔ توجہ کرو یا نہ کرو۔ میں بدقسمت توجہ کی ہرگز حقدار نہیں۔ تم کو مجھ سے نفرت ہو گئی ہوگی اور ہونا چاہئے۔ لیکن احمد کیا تم یقین کرو گے کہ مجھے تم سے وہی لگاؤ ہے جو تھا۔ میں اسوقت تمہیں سراپا طنز دیکھ رہی ہوں۔ تم اس کو پڑھ پڑھ کر ترشی

کے ساتھ مسکراتے ہوگے جیسا کہ تمہاری فطرت ہے مگر میں جھوٹ نہیں بکتی۔ میں اب بھی وہی بدورا ہوں۔ میری طبیعت اب بھی نہیں بدلی ہے۔ یہ حقیقت حال میں مجھ پر منکشف ہوئی ہے کچھ دن کے لئے مجھے دھوکہ ضرور ہوگیا تھا کہ میں بدل گئی ہوں۔ میری آنکھوں پر پردے پڑگئے تھے۔ میں محبت کی حقیقت اور اہمیت سے منکر ہوگئی تھی۔ میرا خیال تھا کہ محبت کوئی ایسی ضروری چیز نہیں۔ میں نے اپنے بچپن کا ایمان کھو دیا تھا۔ میں سمجھی تھی کہ تم میری زندگی کے کوئی لازمی عنصر نہیں ہو۔ اور۔ اب چھپانے سے کیا حاصل مجھے اُمید تھی کہ تم میری دنیا نہیں بنا سکتے۔ اگر مجھکو کوئی اور شوہر ملگیا تو شاید زندگی زیادہ خوشگوار اور پر کیف ہو سکے۔ دیکھتے ہو مجھے دنیا بنانے کی فکر تھی۔ دنیا تو یوں گئی۔ عاقبت کی خبر خدا جانے۔ مجھے اس ارتداد کی سزا مل رہی ہے۔ لیکن آخر میں سارا الزام اپنے سر کیوں لئے لیتی ہوں اس ملک میں تو شادی اور اس کے نتائج کے ذمہدار والدین ہوتے ہیں۔ میں نے اپنے خیالات سے تم کو آگاہ کر دیا تھا کہ دوبارہ فریب دینے کی مرتکب نہ ہوں۔ ورنہ میری شادی میرے باپ کی کی ہوئی ہے اور مجھکو اس میں کوئی دخل نہ تھا۔ بہر حال گنہگار جو کوئی بھی ہو۔ احمد تم مجھکو معاف کر دو۔ زمانہ کے ہاتھوں میں بُری طرح ستائی جا رہی ہوں۔ تم مجھکو نہ ستاؤ۔ میں اپنے جذبات کو عریاں کر کے خط میں نہیں پیش کر سکتی۔ زیادہ نہیں تو ایک بار مجھ سے ملجاؤ۔ میرا دل پھوڑا ہو رہا ہے۔ میں تم سے بہت کچھ کہنا چاہتی ہوں۔ میری کلفتوں کو اب اگر کوئی مٹا سکتا ہے تو وہ تم ہو۔ آؤ ہم ایک دوسرے کی تلخکامیوں کو بھلانے کی کوشش کریں۔ بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم۔

تمہاری خطاوار

بدورا

احمد خط پڑھ کر اسی ترشی کے ساتھ مسکرایا جس کا تصور بدورا نے پہلے ہی کر لیا تھا اور کہنے لگا "بیوقوف عورت تجھے اب بھی نہ معلوم ہوا کہ آسمان کا قاعدہ ایک جبار و قہار کا قاعدہ ہے جس کا مقابلہ کرنا ضعیف البیان انسان کا کام نہیں ہے" اس کے بعد اور کئی خط آئے تھے۔ احمد ابتک یہ فیصلہ نہ کر سکا تھا کہ وہ بدورا کی بگڑی ہوئی حالت دیکھنے جائے یا نہ جائے۔

ایک روز کا ذکر ہے کہ احمد کو تپ چڑھی ہوئی تھی۔ مالتی افسردہ اور دلگیر اس کی چارپائی سے چند گز کے فاصلہ پر ہمہ تن توجہ بنی بیٹھی ہوئی تھی۔ احمد کا چہرہ انگارہ کی طرح دہک رہا تھا اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ اس کو کسی کروٹ آرام نہیں مل رہا تھا۔ وہ کبھی لیٹ جاتا تھا اور کبھی اٹھکر بیٹھ جاتا تھا۔ مگر اس کی نگاہیں مالتی پر جمی ہوئی تھیں وہ ادھر دو ایک ماہ سے دیکھ رہا تھا کہ مالتی رنجیدہ اور فکرمند رہنے لگی تھی۔ وہ اب احمد سے اس شگفتگی کے ساتھ باتیں نہیں کرتی تھی بلکہ زیادہ تر خاموش رہا کرتی تھی۔ احمد اسکی وجہ جانتا تھا۔ وہ اس سے مایوس ہو چلی تھی۔ اس کو یقین ہو گیا تھا کہ احمد لاکھ ہنسنے کی کوشش

کرے مگر وہ اس کی چیز نہیں بن سکتا۔ احمد نے اپنی زمینداری مالتی کے نام لکھ دی تھی۔ مالتی اس سے خوش نہ تھی۔ وہ اپنے دل پر ایک گرانی محسوس کر رہی تھی۔ اس پر بھی وہ احمد کے لئے اپنی جان ہلاک کر دینے کو تیار تھی۔ اس کی یہ روش احمد کو دل ہی دل میں رلا رہی تھی۔ آج وہ انہیں سب باتوں پر غور کر رہا تھا۔ کنپٹی کی رگیں تنی ہوئی تھیں۔ مالتی سمجھ رہی تھی کہ اس کا سر دکھ رہا ہے مگر احمد کچھ کہہ نہیں رہا تھا۔ اس لئے وہ بھی چپ تھی۔ لیکن جب اس نے دیکھا کہ احمد نے اپنے سر میں کس کر رومال باندھ لیا تو اس سے نہ رہا گیا اور اس نے دردناک آواز میں کہا "لائیے سر دبا دوں۔ کیا بہت دکھتا ہے؟"

احمد نے کہا "ہاں بہت دکھتا ہے۔ مگر مالتی میرا سر دکھنے کے لئے بنایا گیا ہے۔ کہاں تک کوئی دبائیگا" یہ کہکر ایک کراہ کھینچتا وہ لیٹ گیا۔ مالتی کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس نے احمد کی طرف سے منہ پھیر کر اپنی آنکھیں پونچھ ڈالیں اور اٹھکر احمد کے سرہانے گئی۔ احمد نے کہا "نہیں میری اچھی مالتی۔ میری پیاری مالتی۔ رومال باندھنے سے مجھکو بڑا آرام مل رہا ہے سر دبانے کی ضرورت نہیں۔ شاید میرے طنز سے تمکو دکھ ہوا مگر میری عادت ہی ایسی ہو اس کا تم کو ملال نہ ہونا چاہئے۔ یہیں میرے پاس بیٹھ جاؤ، میں تم سے کچھ باتیں کر کے اپنی طبیعت ہلکی کرنا چاہتا ہوں" مالتی احمد کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر بیٹھ گئی۔ احمد کا ہاتھ کانپنے لگا

احمد بڑی دیر تک مالتی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ہوئے خاموش پڑا رہا۔ پھر اٹھکر بیٹھ گیا اور کہنے لگا "سمجھ میں نہیں آتا کہ جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں وہ کیسے کہوں۔ میرے دل کی جو کیفیت ہے وہ بیان نہیں کی جا سکتی۔ لیکن تم کو اس سے آگاہ کر دینا ضروری ہے۔ ممکن ہے تم سوچو اور سمجھو۔ میں اپنے اندر ایک ایسی ہلچل محسوس کر رہا ہوں جو مجھے مٹا کر چھوڑیگی۔ ایسی حالت میں اپنے کو ہرگز اس قابل نہیں پاتا کہ کسی اور کو اپنا پابند کروں۔ مجھے اندیشہ نہیں یقین ہے کہ تم میرے ساتھ شادی کر کے کوئی خاص لذت یا راحت نہ حاصل کر سکوگی۔ میری صحت کو گھن لگ چکا ہے۔ میرے دل و دماغ بیکار ہو گئے ہیں۔ یہ تو نہ جانے کس طرح میں کاشتکاری کے کاروبار میں سرگرم رہتا ہوں شاید اس لئے کہ جب تک سانس لے رہا ہوں اس وقت تک سانس لینے کے لئے کوئی بہانہ چاہئے۔ تاکہ زندگی کا بار تحمل کی حد سے زیادہ نہ ہو۔ ورنہ آج اگر میں دل لگا کر کوئی کام کر سکتا تو میں اپنی تجارت نہ چھوڑتا اور تھوڑے ہی دنوں میں جو نقصان مجھے ہوا ہے اسکو پورا کر لیتا اور پھر ترقی کر لیتا۔ مگر بیگم سے روپئے پانے کے بعد سارا قرض چکا کر میں اپاہج کی طرح بیٹھ کیوں رہا؟ صرف اس لئے کہ اب نہ کسی کام میں میرا جی لگتا ہے اور نہ مجھ میں دم ہے کیوں مالتی تمہیں یہ سب سنکر اگر تکلیف ہوتی ہو تو میں یہیں رک جاؤں"

مالتی نے کہا "نہیں نہیں کہئے"۔ وہ سننا چاہتی رہی ہو یا نہ چاہتی رہی ہو مگر آج وہ دل آزار بات سننے کے لئے تیار ضرور تھی۔

احمد نے پھر کہنا شروع کیا "ہاں تو کہنا یہ ہے کہ تم مجھ سے شادی کی امید نہ لگاؤ۔ شادی کے بغیر بھی محبت کی جا سکتی ہے۔ تم محبت کرو۔ میں اپنی روح کی گہرائیوں سے اس کی قدر کرونگا۔ لیکن اپنی زندگی کو میری زندگی سے وابستہ کر کے خواہ مخواہ خراب نہ کرو۔ میں اس کی تاب نہیں لا سکتا۔ میری زندگی کا کوئی ٹھکانا نہیں۔ ابھی دس پندرہ دن ہوئے میرے منہ کو

خون آیا تھا۔ میں نے تم سے چھپا ڈالا تھا۔ لیکن چھپانا بیکار ہے۔ تو میری اچھی مالتی سوچو اور میرا کہا مانو۔ تم سمجھتی ہوگی کہ میں بدورا کی دھن میں تم سے بے توجہی برتتا ہوں۔ یہ تو میں مان لیتا ہوں کہ مجھے اس نوبت تک پہنچانے میں بدورا نے بڑی مدد کی۔ مگر یوں بھی میرا حشر یہی ہوتا۔ میں مقدر میں یہی لایا تھا۔ یہ ابھاگ دو پشت سے میرے ساتھ ہے اب بدورا کو بدنام کرنا غلطی ہے۔ میں اپنی حالت سدھار سکتا تھا۔ تمہارے ساتھ عیش سے زندگی بسر کر سکتا تھا۔ تم جیسی وفا محبت کی دیوی کی دلنوازی کر سکتا تھا۔ لیکن مجھ سے کچھ نہ ہو سکا میں بے بس ہوں۔ یہ اگر مقدر کی خوبی نہیں ہے تو میری نرالی طبیعت کا کرشمہ ہے۔ بہر حال شامت اپنی ہے اس کا الزام کسی دوسرے کے سر نہیں ہے۔ ہاں مالتی یقین مانو میں تمہاری محبت کو ٹھکراتا نہیں۔ میں اگر کبھی اپنے کو اس قابل پاؤنگا کہ شادی کروں تو تمہیں چھوڑ کر کسی کی طرف رُخ نہیں کرونگا۔ مگر مجھ سے وعدہ نہ لو۔ مجھ کو زیر بار نہ کرو۔ میرے دماغ کو ہلکا رہنے دو۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ اس کی بھی قسم کھاؤ کہ تم میری طرف سے کوئی غبار دل میں نہ رکھوگی"۔ احمد کے اندر اس وقت جو طوفان تھا اس سے اس کا بخار اور بڑھ گیا اور اس کا جی سنسنانے لگا۔ وہ پھر ایک کراہ کے ساتھ لیٹ گیا۔ مالتی پر اسکا جو کچھ بھی اثر ہوا ہو۔ اس نے اپنے بشرہ سے کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا۔ وہ احمد کا ہاتھ اسی طرح اپنے ہاتھ میں لیئے رہی احمد کی حالت نازک تھی۔ مالتی نے بڑے صبر و ضبط سے کام لیا اور پیار سے جواب دیا۔ "آپ آخر اتنے ہراساں کیوں ہوتے ہیں۔ خیر یونہی سہی شادی تو ایک دنیا کی رسم ہے۔ اس سے سچی محبت گھٹا بڑھا نہیں کرتی۔ شادی کا خیال آپ کے لئے ایسا سوہان ہے تو جانے دیجئے مجھے کوئی اس کا ملال نہ ہوگا۔ مگر ہاں ایک کہنا میرا بھی مانئے۔ اور اس سے اپنے دل میں کوئی ملال نہ آنے دیجئے"۔

وہ کیا؟ کہو میں تمہاری ہر خواہش پوری کرنے کے لئے تیار ہوں"۔ احمد نے سوال کیا۔

مالتی نے کہا "مجکو اجازت دیجئے کہ میں پھر اپنی جھونپڑی میں جا کر رہوں ۔۔۔۔"

احمد پھر اٹھ بیٹھا اور بات کاٹ کر کہا "مالتی! تم جھوٹ کہتی ہو کہ میری باتوں سے تم کو کوئی دُکھ نہیں پہونچا ہے۔ تم تو آن کی آن میں مجھ سے بیزار ہوگئی ہو۔ ورنہ یہ جھونپڑی میں جاکر رہنے کے کیا معنے؟" احمد کا دم پھولنے لگا تھا۔

مالتی کا دل اُمڈ اچلا آرہا تھا جس کا تقاضہ یہ تھا کہ وہ پھوٹ پھوٹ کر خوب روئے مگر احمد کی حالت اس کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ مالتی نے اپنی آواز پر قابو رکھتے ہوئے کہا "آپ مجھ سے قسم لے لیجئے کہ مجھکو کوئی دکھ نہیں پہنچا ہے اور نہ آپ نے کوئی دکھ پہنچانے کی بات کی ہے۔ میں اپنی جھونپڑی میں رہ کر بھی آپ کی اسی طرح خدمت کرتی رہونگی۔ اگر مجھے آپ سے کدورت ہوتی تو یہ جو آپ نے اپنی ساری پونجی میرے حوالہ کر دی ہے میں اس کو ہرگز گوارا نہ کرتی۔ بس میری خواہش ہے کہ آپ اچھے ہو جائیں تو میں پھر اسی جھونپڑی میں جا کر رہنے لگوں اور بدستور آپ کی کنیز بنی رہوں۔ اس سے دونوں آزاد رہیں گے اور آپ کی طبیعت پر کوئی بوجھ نہیں رہیگا"۔

احمد نے مالتی کو شبہ کی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا "مالتی تم اگر کہو تو تمہاری کہیں شادی کر دی جائے"۔

مالتی نے کسیقدر خشک لہجہ میں کہا "اب البتہ آپنے میری روح کو صدمہ پہنچایا ہے۔ آخر یہ خیال آپ کے دل میں کیوں آیا"۔

احمد نے جلدی سے ندامت کا اظہار کر کے کہا، "اچھا معاف کر دو۔ ہاں بیشک میں نے تم کو رنج پہنچایا۔ میں بھی کیا بدبخت ہوں!" مگر احمد کی تشفی نہیں ہوئی۔ اس کا شبہ بدستور قایم رہا اور شبہ یہ تھا کہ شاید مالتی بھی اس سے تنگ اور عاجز ہوگئی ہے ورنہ اس سہولت سے شادی کے خیال کو ترک کر دینے پر کیوں آمادہ ہوگئی۔ اب تک تو یہی مالتی شادی کی امید ہی کے سہارے جی رہی تھی۔ احمد کو خود اپنی تندرستی مایوس کن نظر آرہی تھی اس کو زیادہ دنوں تک جینے کی امید نہ تھی۔ اس کو بدگمانی ہونے لگی کہ مالتی بھی اب اس کی زندگی سے مایوس ہوگئی ہے اس لئے آزادی چاہتی ہے۔ احمد نے ایک گہری سانس لی اور دل میں کہا "آخر کوئی کسی کی سیہ بختی کا ساتھ کہاں تک دے۔ آخر میں اپنی قسمت اپنے ہی ساتھ ہے" اس نے مالتی کو اجازت دیدی کہ وہ جاکر اپنے باپ کی جھونپڑی میں رہے۔ اُسنے جھونپڑی کو از سر نو بنوا بھی دیا۔ مالتی کی اس حرکت سے احمد کو کوئی رنج تو ہوا نہیں بلکہ اس کے دل سے واقعی بوجھ ہلکا ہو گیا۔ ہاں اُس کو عبرت ضرور ہوئی۔

عورت کی نسائیت کا سارا راز اس کی خود فراموشی نفس کشی اور ایثار میں مضمر ہے۔ یہی اس کی زبردست قوتیں ہیں جو اس کی فتوحات کی ضامن ہیں اور جو حقیقتاً اس ضد کی کارفرمائیاں ہیں جس سے عورت کی سرشت ہوئی ہے۔ خودغرض سے خودغرض عورت بھی جب محبت کرنے لگتی ہے تو پھر وہ محبت کی ہو رہتی ہے اور انجام سے قطع نظر کر لیتی ہے۔ رنج و راحت سے بے نیاز ہو کر بے غرضی کے ساتھ محبت کرنا عورت کا امتیازی تمغہ ہے وہ جان بوجھ کر اپنے دل میں ایک کانٹا چبھو لیتی ہے اور جتنا ہی زیادہ یہ کانٹا پیوست ہوتا جاتا ہے اتنا ہی زیادہ اس کو لذت ملتی ہے۔ مرد کی محبت ایسی نہیں ہوتی۔ وہ اگر سوچ سمجھکر محبت نہیں کرتا تو محبت کے دوران میں ضرور سوچتا سمجھتا رہتا ہے۔ وہ اپنی محبت میں ایک خاص غرض و غایت پیش نظر رکھتا ہے۔ عورت محبت میں اندھی ہو جاتی ہے اور اسی وجہ سے اس کی محبت ایک ایسی قوت ہے جس کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ فطرت کے مختلف شعبدہ بھی اس نے انسان کو غارت کرنے کے لئے جہاں اور اسباب مہیا کئے ہیں وہاں ایک سبب عورت بھی ہے۔ مالتی بھی اسی قسم کی عورت تھی۔ وہ احمد کو اپنی ہستی کے ایک ایک ذرہ سے چاہتی تھی اور اس کی محبت فی الحقیقت بے مدعا تھی۔ اس نے دیکھا کہ احمد سے شادی کی اُمید کرنا اس کی جانکاہیوں میں اضافہ کرنا ہے اور احمد کی حالت اسکی تاب نہیں لا سکتی اسلئے وہ نہایت خوشدلی کے ساتھ بغیر پیشانی پر بل لائے ہوئے احمد سے الگ ہوگئی۔ اُس نے مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ آج سے محبت کے جانگسل خمیازے وہ یکہ و تنہا برداشت کریگی۔ احمد نے شروع میں مالتی کی اس ادا کو غلط سمجھا مگر رفتہ رفتہ حقیقت اسپر روشن ہوگئی مالتی کی شکست نے اپنی فتح حاصل کر لی۔ احمد مالتی کے خیال کو دل سے نکالنا چاہتا تھا لیکن کامیاب نہ ہوتا تھا۔ مالتی اسکی یکسوئی میں رخنے پیدا کر رہی تھی۔ چنانچہ آج اگر بدورا اسکول بھی جاتی تو بھی شاید وہ سکون و اطمینان کی سانس نہ لے سکتا۔ اتفاقاتِ زمانہ نے کچھ ایسی صورت ہی پیدا کر دی تھی۔ (باقی)

مجنوں گورکھپوری

شاہان بہمنیہ

محمد بن قاسم کا حملہ مسلمانوں کے پہلے حملے سے تعبیر کیا جا سکتا ہے مگر دکن میں سنہ ۹۰ھ ہی میں مسلمان آگئے اور یہی ان کی آمد کہی جا سکتی ہے، عبد الملک بن مروان کے سپہ سالار حجاج بن یوسف کے مظالم سے کون واقف نہیں وہ عبد الملک کی طرف سے عرب اور عجم کا صوبہ دار تھا، اس کے مظالم، بے باکیاں، سفاکیاں، خونریزیاں، نچلے طبقے تک ہی محدود نہیں بلکہ اُسنے شرفاء عرب اور سادات بنی ہاشم کے قتل کا بیڑا اٹھایا تھا، سادات کو خانماں برباد اور شرفاء کو تباہ و تاراج کرنا، اس کا نصب العین تھا اور اسکی ظلم و زیادتیاں عالمگیر تھیں، آل مصطفوی کو اس کے ہاتھوں ایسی تکالیف پہونچیں کہ یزید ہی کا زمانہ آنکھوں میں پھر گیا،

سادات و شرفاء عرب نے مجبوراً ہجرت کرنی شروع کی اور چند قبائل عرب نے بنادر دکن کا رخ کیا، باد مخالف کے جھونکوں نے کئی دن تک ان خانماں بربادوں کو پریشاں و سرگرداں پھرا کر ان کے ٹوٹے پھوٹے جہاز بندر مالابار یعنی بندر بھڑوچ، کھنبایٹ، چیول، دابول کے کنارے لگا دیئے۔

دکن کے ہندوؤں کے نزدیک یہ قوم ملیچھ اور نئی تھی، پہلے تو ان کو جہازوں سے اترنے ہی نہیں دیا گیا مگر جب ان لوگوں نے خوشامد درآمد شروع کی تو ایک اقرار نامہ لیکر ٹھہرنے کی اجازت دی، اقرار نامہ کا مضمون یہ تھا کہ:- "مسلمان ہنود کے مراسم اختیار کریں اور انہیں کا لباس استعمال کریں - ارکان اسلام علی الاعلان ادا نہ کریں" غریب مسلمانوں کو سر چھپانا منظور تھا سنگ آمد و سخت آمد کہکر یہ شرطیں منظور کر لیں اور ہنود میں مل جل کر گزر بسر شروع کی، شعائر اسلامی بہت احتیاط سے ادا کئے جاتے تھے اذان و قرات گھر کی چار دیواری کے باہر سنائی نہ دیتی تھی، عورت اور مرد ہنود کا لباس استعمال کرتے تھے اور شادی و غمی میں ہنود ہی کے رسوم ادا کئے جاتے تھے رفتہ رفتہ تمام مسلمانوں نے اہل ہنود کے پورے طریقے اختیار کر لئے البتہ اس قدر لحاظ ضرور رکھا کہ نہ تو اپنی لڑکیاں ہندوں کو دیں اور نہ ان کی لڑکیاں اپنے خاندان میں لیں،

سنہ ھ سے دکن میں بزرگان دین کی آمد شروع ہوئی جو ایک طرح سے مبلغین کہلا سکتے تھے ان میں بعض تاجر تھے بعض درویش اور بعض سپاہ مگر سب کا نصب العین ایک ہی تھا اور مختلف طریقوں سے تبلیغ کیا کرتے تھے، ان لوگوں کے حسن و اخلاق کا اثر ہنود پر بہت گہرا پڑا اور منافرت جو پہلے مسلمانوں سے تھی اب نہ رہی اور بہ خندہ پیشانی مسلمانوں سے پیش آنے لگے ان بزرگوں کی کرامات اور خرق عادات سے ہنود نے انہیں اوتار مان لیا اور حالت رنج و غم، مصیبت و پریشانی میں طالب داد و دعا ہونے لگے، صرف عام ہنود ہی مسلمان مبلغین کے معتقد نہ تھے۔ بلکہ راجگان دکن کو بھی ارادت تھی، جب لوگوں نے حکومت کا میلان بھی اسلام کی طرف دیکھا تو ایک ایک کر کے مسلمان ہونے لگے، یہ صرف مسلمانوں کی تعلیمات

اور اخلاق تھے ورنہ ہندو اپنی حکومت میں کیوں اسلام کو جاری ہونے دیتے۔

راجگانِ دکن کی یہ بے تعصبی بھی لائقِ تحسین و تشکر ہے کہ انھوں نے جب ہندوؤں کا رجحان مذہبِ اسلام کی طرف دیکھا تو نہ تو ہندوؤں کو مسلمان ہونے سے روکا اور نہ مبلغینِ اسلام سے باز پرس ہی کی۔

ادہر دکن میں اس طرح چپکے چپکے اسلام کی اشاعت ہو رہی تھی اور ادہر سلطان محمود غزنوی کی تیغ براں اپنے جوہر دکھا رہی تھی بہر حال چوتھی صدی کے آخر تک دکن میں شاید ہی کوئی قصبہ ایسا ہوگا جہاں آفتاب اسلام کی شعاعیں اپنی نورانی کرنوں سے روشنی نہ پیدا کر چکی ہوں، اس وقت دکن میں حسب ذیل چار سلطنتیں قایم تھیں،

(۱) راجہ رام چندر نے دیوگیری میں یادہری حکومت قایم کی تھی جو ۱۲۷۱ء سے ۱۳۱۰ء تک رہی،

(۲) رانی رودرا مہا نے ورنگل میں کاکتیا حکومت قایم کی جو ۱۲۹۱ء سے ۱۳۲۳ء تک رہی

(۳) ہتنارا اور نیلور کی ہائیسالہ حکومت،

(۴) پانڈیہ جو جنوبی حصہ پر قابض تھے،

جب غزنوی اور غوری خاندان کے بعد خاندانِ غلامان نے حکومت قایم کی اور پھر خلجی خاندان کو عروج ہوا تو علاء الدین خلجی نے جو جلال الدین خلجی کا بھتیجہ تھا، تسخیر دکن کا ارادہ کیا اس سے پہلے کسی نے اس طرف کا رُخ نہیں کیا تھا، یہ حملہ ۱۲۹۴ء میں اتفاقاً ہوا اور قسمت نے اس کو دکن کا پہلا فاتح بنا دیا، اس حملہ کی وجہ یہ تھی کہ علاء الدین گورنر کڑہ جب بھیلسان میں مقیم تھا تو اُس کو اطلاع ملی کہ دکن کے راجہ رام دیو کے پاس موروثی خزانہ محفوظ ہے اور وہ ایسا گرانمایہ خزانہ ہے کہ آج تک کسی بادشاہ کو میسر نہیں ہوا، یہ سنتے ہی وہ کڑہ سے نکلا اور بقول ضیاء برنی آٹھ ہزار سوار ہمراہ لیکر دیوگیری کی طرف کوچ کیا اور دکن میں پہونچکر لاجور گھٹی میں ڈیرے ڈالدئے۔

اس علاقہ کے دہشت زدہ کسانوں نے یہ خبر راجہ رام دیو کو پہونچائی اور وہ نہایت ہی عجلت سے ایک غیر منتظم کثیر لشکر مقابلہ کے لئے فراہم کیا۔ مگر علاء الدین کے جوش و خروش کے آگے اس لشکر کے قدم نہ جمے اور علاء الدین دیوگیری پہونچ گیا، علاء الدین کے متواتر جانبازانہ حملوں نے راجہ کو اس قدر سراسیمہ کر دیا کہ اس نے فوراً صلح کی کوشش شروع کی اور چھ سو من طلا، سات من مروارید، دو من جواہر (لعل یاقوت وغیرہ) دیکر اور سالانہ خراج ادا کرنے کی شرط پر صلح کر لی۔

جب علاء الدین تخت نشین ہوا اور اندرونی الجھنوں سے نجات ملی تو ۱۳۰۶ء میں دیوگیری کو صوبہ بنانے کے خیال سے رام دیو کی سرکشی کا بہانہ کر کے ملک کافور ہزار دیناری کو ایک لاکھ سوار سپاہیوں کے ساتھ روانہ کیا، ملک نائب نے نہایت ہی سہولت سے دیوگیری پر قبضہ کر لیا اور رام دیو اور اس کے بیٹوں کو گرفتار کر کے خزانہ شاہی کے ساتھ علاء الدین کے سامنے پیش کر دیا، علاء الدین نے نہایت دور اندیشی سے کام لیکر رام دیو کو "رائے رایاں" کے خطاب سے سرفراز کیا اور چتر سفید دیکر دوبارہ دیوگیری کی حکومت عطا کی،

۱۳۰۹ء میں ملک کافور نے درنگل پر حملہ کیا اور راجۂ درنگل نے بوعدۂ خراج صلح کر لی۔

۱۳۱۲ء میں علاء الدین نے دکن پر آخری حملہ کیا اور راجۂ دیوگیری کی بغاوت کی وجہ سے ملک کافور کو روانہ کر کے دیوگیری کو تباہ و تاراج کرنے کے علاوہ راجہ (شنکر) کو بھی قتل کرا دیا۔

۱۳۱۵ء میں علاء الدین نے انتقال کیا اور راجگان دکن نے سرکشی کی۔ مگر ۱۳۲۰ء میں محمد تغلق نے پھر دکن کے علاقۂ تلنگانہ پر قبضہ کر لیا۔

۱۳۴۳ء میں دکن کے راجاؤں نے پھر سرکشی کی اور بغاوت کر کے شہر وجیانگر آباد کیا، دکن کے ممالک مفتوحہ تقریباً سب کے سب مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گئے۔ البتہ صرف دیوگیری پر سلطان محمد کا قبضہ رہا۔

ملک دکن کو کھو کر سلطان دوآبہ کی طرف متوجہ ہوا ہی تھا کہ بیدر میں نصرت خان اور گلبرگہ میں علی شاہ نے بغاوت کی جسکو فرو کرنے کے لئے قتلغ خاں حاکم دیوگیری روانہ کیا گیا، جس نے نصرت خاں کو سمجھا بجھا کر راضی کر لیا اور علی شاہ کو گرفتار کر کے سلطان کی خدمت میں روانہ کیا۔ مگر ساتھ ہی ساتھ یہ غلطی بھی کی کہ قتلغ خان کو دکن سے طلب کر کے نظام الدین عالم الملک کو دکن روانہ کیا سلطان محمد نے امیرانِ صدہ کی بغاوتوں سے تنگ ہو کر ان کے قتل کا ارادہ کر لیا اور سپہ سالار دکن کے نام فرمان بھیجا کہ ایک ہزار پانسو سواروں اور امیران صدہ کو بھروچ روانہ کر دے۔ عالم الملک نے نہایت ہی وقت سے امیراں صدہ کو دولت آباد (دیوگیری) بلوایا اور سلطان کی خدمت میں روانہ کیا، مگر جب یہ لوگ مانک دون پہونچے تو سلطان کی متلون مزاجی اور خونین طبیعت سے خائف ہو کر آپس میں مشورے کرنے لگے اور واپسی کا ارادہ کر لیا، ملک لاجین کی شامت جو آئی تو اس نے روکنا چاہا مگر یہ کب ماننے والے تھے اس کو قتل کر دیا اور مال و اسباب لوٹ کر دولت آباد کی طرف چلے، دولت آباد پہونچ کر قلعہ کا سختی کے ساتھ محاصرہ کر لیا اور چندہی روز میں فتح کر کے خزانہ بانٹ لیا۔ اور اسمٰعیل مغ کو بادشاہ تسلیم کر کے ناصر الدین کا خطاب دیا۔ چتر شاہی سے عزت افزائی کی، حسن خان کو ظفر خان خطاب دیا اور ہر ایک اپنی اپنی جاگیروں میں جا کر باغی ہو گیا۔

حسن خان نے رائے بہیرن حاکم گلبرگہ کو قتل کر کے تسلط کیا اور اطراف کے امیرانِ صدہ کو بلا کر حکومت مستحکم کی، چندہی مہینوں میں سارا دکن سلطان کے ہاتھ سے نکل گیا اور سلطان پریشان ہو کر دولت آباد پہونچا، اسمٰعیل مغ نے مقابلہ کیا مگر شکست نصیب ہوئی اور وہ دہارگیر میں جا کر قلعہ بند ہو گیا دوسرے امرا بھی اپنی اپنی جگہ قلعہ بند ہو گئے۔ سلطان نے دہارگیر کا رخ کیا ہی تھا کہ حاکم گجرات کے بغاوت کی خبر ملی اور وہ قوام الدین خداوند زادہ اور دیگر امرا کو محاصرہ پر چھوڑ کر خود گجرات روانہ ہو گیا۔

ادہر حسن خان نے بیدر پر حملہ کر دیا اور تلنگانہ کے راجہ کی مدد سے عماد الملک کے لشکر کو تہس نہس کر کے اور اس کو قتل کر کے اسمٰعیل مغ کی مدد کے لئے روانہ ہوا، حسن کا نام سنکر محاصرہ کنندہ امرا نے فرار پر فرار کیا اور حسن نے اطمینان سے دولت آباد پر قبضہ کر لیا، اسمٰعیل مغ نے حسن کی ہر دلعزیزی اور شجاعت دیکھکر یہی مناسب خیال کیا کہ اسی کو بادشاہ بنا دے چنانچہ وہ سلطنت سے دست بردار ہو گیا اور حسن گانگو کو بادشاہ بنا دیا۔ ۱۳۴۷ء میں سلطان علاء الدین حسن گانگو بہمنی کو دولت آباد

کی مسجد میں سب نے بادشاہ تسلیم کرلیا اور سر پر تاج سلطانی اور چتر سیاہ قایم کیا گیا، اور ممالک دکن میں اسی کے نام کا خطبہ پڑھا جانے لگا حسن نے گلبرگہ کو پسند کر کے دارالسلطنت مقرر کیا اور حسن آباد نام رکھا۔

یہ تھی ابتدا سلطنت بہمنیہ کی، مگر علاء الدین حسن بہمنی کے ابتدائی حالات نہایت ہی تاریکی میں ہیں، مورخین نے سخت اختلاف کیا ہے۔ طاہری نے مجہول النسب لکھا ہے، زبدۃ التواریخ میں مفلوک الحال ترکی الاصل بتایا ہے فرشتہ نے گانگو پنڈت منجم کا ملازم ٹھیرایا ہے، تحفۃ الملوک میں شریف زادہ اور محمود شاہی اغاغنہ سے لکھا ہے صوفی ملکاپوری نے مدت کی تلاش و جستجو کے بعد حسن کا امیر زادہ اور ملوک غوریہ سے ہونا ثابت کیا ہے، "مرات الصفا" نے تو بہمن (شاہ عجم) کے خاندان سے ملا دیا ہے۔

ہمارے مورخین کا قاعدہ ہے کہ جب کسی بادشاہ سے دلچسپی ہوجاتی ہے تو اس کو خواہ مخواہ بڑا بنانے کی فکر کرتے ہیں یا تو اسکا شجرہ نسب ائمہ مطہرین یا سادات بنی ہاشم سے ملا دیتے ہیں یا تو شیروان و افراسیاب سے ورنہ کسی مشہور صاحب دل بزرگ، یا بادشاہ سے شجرہ ملا دینا معمولی بات ہے اسی طرح حسن بہمنی پر بھی مہربانی کی ہے۔

ظفر خاں علائی کے قتل کے بعد اسکا خاندان پریشان ہوگیا۔ حسن شاہ اور علی شاہ اس کے دو بھانجے بھی انہیں پریشان حال لوگوں میں تھے، فاقہ کشی سے تنگ آکر حسن نے دہلی کا رُخ کیا اور کئی روز کی مسافت طے کر کے صبح صبح دہلی پہونچے، دریائے جمنا کا پانی اٹھکیلیاں کر رہا تھا۔ حسن نے وضو کیا اور فریضۂ فجر کی نیت کی۔ فاقہ کشی اور مصائب سفر نے اس قدر پست کر دیا تھا کہ قدم قدم پر چکر آ رہا تھا۔ ٹھنڈے پانی سے وضو کر کے جمنا کی سرد ریت پر سر بسجود ہوا ہی تھا کہ نیند یا غشی نے غلبہ کیا اور وہ حالت سجدہ ہی میں بیہوش ہوگیا، منجم شاہی گانگو پنڈت حسب عادت غسل کے لئے آیا تو دیکھا کہ ایک جوان رعنا سجدہ میں پڑا ہوا ہے، چہرے سے آثار شرافت و شجاعت نمایاں ہیں گو خستگی سفر نے رنگت سیاہ کر دی ہے مگر آفتاب کی بھیگی بھیگی کرنیں زرد رخساروں کو چمکا رہی ہیں، برہمن نے حسن کو جگا کر حال دریافت کیا اور اشنان کے بعد اسکو اپنے گھر لے آیا، کئی دن تک حسن، برہمن کا مہمان رہا مگر اس کی غیور طبیعت نے پڑے پڑے روٹیاں کھانا گوارا نہیں کیا اور اُس نے برہمن سے کہا کہ یا آپ مجھ سے کچھ کام لیا کیجئے یا کوئی کام دلوا دیجئے۔ برہمن نے دو بیل اور دو مزدور اور تھوڑی سی زمین اس کو دی اور حسن نے کھیتی باڑی شروع کی، ایک دن اس کے مزدور ہل چلا رہے تھے کہ یکایک ہل کا سرا زمین میں پھنس گیا اور باوجود کوشش کے نہ نکلا مزدوروں نے حسن کو اطلاع کی اور حسن نے زمین کھدوا کر دیکھا تو ہل کو ایک زنجیر میں اٹکا ہوا پایا، زنجیر نکالنے کی کوشش کی تو اس کے ساتھ ایک دیگ برآمد ہوئی جسمیں اشرفیاں بھری ہوئی تھیں حسن نے اُس دیگ کو بہ حفاظت برہمن کے حوالہ کر دیا برہمن کو حسن کی دیانت و راست بازی پر تعجب ہوا کہ باوجود فاقہ کشی اس میں اس قدر امانت و دیانت ہے۔ اس نے یہ خبر شاہزادہ کو دی اور شاہزادے نے ایک دفعہ غیاث الدین سے حسن کا تذکرہ کیا، غیاث الدین نے حسن کو بلا کر اس کا حال پوچھا اور یہ معلوم کر کے کہ وہ ظفر خاں علائی کا ہمشیر زادہ ہے امیران صدہ میں داخل کر لیا، چونکہ غیاث الدین ظفر خاں کا دوست رہ چکا تھا

اس لئے حسن پر بہت مہربان رہنے لگا۔

غریب اور مفلوک الحال حسن کو امیرِ صدہ ہوتے دیکھ کر گانگو منجم نے زائچہ بنایا تو دیکھا کہ حسن کے ستارے بادشاہت میں ہیں، اس نے حسن سے کہا کہ تم دکن کے بادشاہ ہوجاؤ گے اور یقین ہے کہ اس وقت مجھے یاد بھی نہ کروگے کہ کسی برہمن نے میری مدد کی تھی حسن نے کہا نہیں ایسا نہیں ہوسکتا اگر میں بادشاہ ہوگیا تو آپ کو وزیر بناؤنگا اور آپ کے نام کو اپنے جزوِ نام کرلونگا۔

یہ روایت کسی قدر قریب قیاس ہے اس کا امکان ہے کہ حسن ظفر خان علائی کے خاندان سے ہو اور فاقہ کشی کرتا ہوا دہلی پہونچا ہو، اس وقت ہندو مسلم اتحاد کا وقت تھا برہمن نے ممکن ہے کہ اس کی مدد کی ہو اور تھوڑی سی زمین کاشت کرنے کے لئے دی ہو، پہلے تو ہندو مسلمانوں کے اس قدر متفرق نہ تھے جتنے کہ اب ہیں اور نہ مسلمانوں نے اپنے آپ کو اس قدر غیر معتبر اور خوفناک بنا لیا تھا جیسی حالت کہ اب ہے، دلی ہزاروں دفعہ اجڑی اور آباد ہوئی اب بھی کروڑوں خزانے سیکڑوں دفینے ہوں گے۔ کیا عجب ہے کہ حسن کو بھی کوئی ایسا دفینہ ملا ہو اور اس نے برہمن کے حوالہ کردیا ہو جس کی شہرت غیاث الدین تک پہونچی ہو، ماہرانِ نجوم جانتے ہیں کہ امارت و بادشاہت کی پیشین گوئی اجرام فلکی کی رفتار دیکھ کر بہ آسانی کی جاسکتی ہے اسیطرح یہ ناممکن نہیں کہ برہمن حسن کی بادشاہت کی پیشین گوئی کرسکے۔ اور برہمن سے اس کے نام کو جزوِ نام کرنے کا وعدہ کرے علاوہ ازیں آج تک نہ کوئی گانگوی خاندان تھا اور نہ بہمن شاہ عجم کے خاندان کے کسی فرد نے اپنے آپ کو بہمنی کہا ایسی حالت میں سوائے اس کے کہ ہم اس روایت کو قرینِ قیاس تصور کریں کوئی چارہ نہیں۔

حسن کو دکن پہونچنے کی بہت جلدی تھی جب بادشاہ نے قتلغ خان کو دولت آباد (دیوگیری) کا صوبہ دار مقرر کیا اور امیرانِ صدہ سے دکن جانے کے متعلق دریافت کیا تو سب سے پہلے حسن نے آمادگی ظاہر کی اور بادشاہ نے ہگڑی، رائے باغ وغیرہ جاگیر دے کر حسن کو دکن روانہ کردیا اس نے اپنے ہمراہ اسمٰعیل مغ اور ملک سیف الدین غوری کو بھی لے لیا اور دولت آباد کا رُخ کیا، یہاں پہونچکر حسن نے جو کچھ کیا اس کی تفصیل اوپر لکھی جاچکی ہے۔

۲۴ ربیع الاول ۷۴۸ھ کو دولت آباد کی قطب الدین خلجی کی مسجد میں حضرت شیخ سراج الدین جنیدی رحمۃ نے حسن کو تخت نشین فرمایا اپنے دستِ مبارک سے تلوار باندھی اور تاج زرین پہنا کر چترِ سیاہ تبرکاً لوازمۂ شاہی مقرر کیا، اس چتر کی وجہ سے لوگوں نے حسن کو شیعی خیال کرلیا ہے۔ مگر واقعہ یہ نہیں ہے حضرت شیخ جنیدی نے سیاہ چتر کو خلفائے عباسیہ کا نشان سمجھ کر پسند فرمایا تھا۔

حسن نے گلبرگہ کو دار السلطنت قرار دیا اور دفتر حساب گانگو پنڈت کے سپرد کیا یہ طریقہ ۱۰۱۶ھ تک جاری رہا کہ شاہانِ دکن کی دفترداری اور محرری برہمنوں ہی کو ملتی رہی۔

حسن نے اپنی شمشیر اور تدبیر کے زور سے دکن کے ایک بڑے حصہ پر قبضہ کرلیا ایک مہم کرناٹک کی طرف بھیج کر اسمیں بھی

کامیابی حاصل کی۔ اہل گجرات تغلق کے ہاتھوں سے تنگ تھے انھوں نے حسن کو بلوایا مگر وہ خود نہ جا سکا اس لئے اپنے بیٹے محمد کو روانہ کر دیا شہزادۂ محمد گلبرگہ سے نکل کر نوساری پہونچا اور وہاں شکار کی کثرت دیکھ کر بے چین ہو گیا خود بھی وہیں ٹھہر گیا اور حسن کو بھی بلوایا۔ مگر حسن نوساری پہونچتے ہی ہیضہ کر گیا اور اس سے صحت پا کر اور امراض میں مبتلا ہو گیا جن کا سلسلہ چھ مہینے تک رہا اور ۵ ربیع الاول ۷۵۹ھ میں (۶۷) سال کی عمر پا کر گیارہ سال دو ماہ سات روز سلطنت کرنیکے بعد انتقال کیا۔

چون حسن رحلت ازین عالم نمود
وصل شد با حق بفضل ذوالمنن

شاہ جنت سال ترحیلش بگو
ہم مقرب محسنِ عالم حسن

۷۵۹ھ ۷۵۹ھ

حسن کے انتقال کے وقت مرہٹواڑی، ملنگانہ، کرناٹک کے مختلف حصے سلطنتِ بہمنیہ میں شامل تھے، جن پر ہندو راجاؤں کا تسلط تھا، مشرق میں راجۂ تلنگانہ، جنوب میں راجۂ بیجانگر، کرناٹک پر قابض تھے اور یہ ایسے بڑے ضرے تھے کہ حسن کو ہمیشہ ان سے خدشہ لگا ہوا تھا، حسن نے سلطنت کو بہت وسعت دی اور نہایت ہی بیدار مغزی کے ساتھ سلطنت کی دریائے پونا سے قلعۂ ادھونی تک اور چیول، دابل سے بیدر تک اسکا قبضہ تھا۔ اس نے نئی نئی اصلاحیں کیں اور سلطنت بہمنیہ کی جڑیں اس قدر مضبوط کر دیں کہ وہ دیر تک حوادثاتِ زمانہ کا مقابلہ کرتی رہی۔ انتظام مملکت، عدالت، سیاست وغیرہ سے اُسے خاصی دلچسپی تھی اور وہ ہر کام نہایت ہی تجربہ کاری اور وسیع النظری سے کیا کرتا تھا، ذیل کے نقشے سے ظاہر ہوگا کہ اس نے کیسے عہدے قائم کئے تھے اور ان عہدوں پر کس قدر تجربہ کار۔ اور موزوں اشخاص کا تقرر ہوا تھا

نام عہدہ دار	نام عہدہ	نام عہدہ دار	نام عہدہ
سید صدر الشریف سمرقندی	صدرِ عدالت	صفدر خاں سیستانی	شقدار صوبۂ برار
سید محمد بدخشی	قاضی عسکر	اعظم ہمایوں	،، ،، ورنگل
ملک سمٰعیل منج	امیر الامراء	خان محمد بن علی شاہ	نائب صوبۂ دولت آباد
سید رضی الدین جگاجوت	معتمد و وکیل السلطنت	محمد اسحٰق سرہندی	صدر وقائع نگاراں
ملک سیف الدین غوری	وکیل السلطنت	بہادر خاں بن اسمٰعیل منج	سپہ سالار
گانگو پنڈت	صدر محاسب	کلیم اللہ ماژندرانی	سرخیل
سکندر خاں	بارمک	بایزید خاں	میر بحری
قیر خاں	کوتوال شہر	ملک جیجو	شحنہ فیل
بہرام خاں ماژندرانی	شقدار صوبۂ دولت آباد	ملک رشدو	جامدار

نام عہدہ دار	نام عہدہ	نام عہدہ دار	نام عہدہ
سید جمال الدین	خزانہ دار	سید نور الدین	محتسب (نرخی)
فولاد خاں	توربیگی	سید تقی اصفہانی	صدر محفلیں
سید احمد ہردی	مفتی	میرزین العابدین	تمغاچی کروڑ (کسٹم کمشنر)

اس کے علاوہ ملک ستم، پردہ دار، ملک قوام الدین غوری، افسر خاصہ خیل، شیخ منہاج الدین جنیدی قاضی گلبرگہ ملک لتنہ، شحنۂ بارگاہ اور آبدارخانہ، خدمت عرض مکرر، ڈاک چوکی، تعمیرات، وغیرہ وغیرہ کے لئے جائدادیں نامزد کی گئی تھیں، ہفتہ میں ایکبار چہار شنبہ کو صبح سے دوپہر تک "بارگاہ کل" (دربار عام) ہوا کرتا تھا، انتظام عدالت بالکل شرعی تھا، ایک صدر عدالت اور اس کی ماتحتی میں کئی مفتی، محتسب، قاضی، فوجدار، داروغہ، وغیرہ تھے، سلطنت چار صوبوں میں تقسیم کی گئی تھی اور ہر صوبہ کے متقر پر دس ہزار اور پیادہ فوج رہتی تھی اور پایہ تخت میں ایک لاکھ جمعیت، فوج کے لئے خاص وردی مقرر کی گئی تھی، -

(۱) سواروں کی وردی - قبا، خود، شمشیر، نیزہ، دستارِ سُرخ،

(۲) پیادوں کی وردی - پاجامہ (برجیز نما) الخالق بطور کھیچہ کلاہ مدور سیاہ،

(۳) کرناٹکی سواروں کی وردی - پاجامہ زانو تک کچہ سیاہ پگڑی سرخ بلدار

(۴) نایک واڑی پیادوں کی وردی - سواروں کی وردی کی مگر قیمتی اور خوشنما،

(۵) امرا، و وزراء کا لباس - قبا، دستار، منصب داری، بگلوس

(۶) مشائخ و علماء کا لباس - جبہ، کرتا، صدری، عمامہ،

اس کے علاوہ خدام و شاگرد پیشہ لوگوں کو قبا، کلاہ، بگلوس، اور نقباء و چوبداروں کو قبا، کلاہ عصا، بگلوس وغیرہ، ہر چھوٹے سے چھوٹے قصبے میں مساجد بنائے گئے تھے اور ہر ایک مسجد کے لئے امام موذن، مدرس، مقرر تھے جو لڑکوں کو تعلیم دیا کرتے تھے - بڑی مساجد میں طلباء کے لحاظ سے مدرسین مقرر کئے جاتے تھے -

خود حسن کو علم و ادب سے گہری دلچسپی تھی ہمیشہ علماء کی صحبت میں رہا کرتا تھا، مولانا لطف اللہ سبزواری، ملا معین ہردی مفتی احمد ہردی، ملا اسحٰق شیرازی، ملا فضل اللہ انجو، ملا حکیم علیم الدین تبریزی، حکیم نصیر الدین شیرازی، صدر الشریف سمرقندی، ملک رکن الدین غوری ملک سیف الدین غوری، سید رضی الدین جنگ جوت وغیرہ جیسے علماء و حکماء بہمنیہ اس کے ساتھ رہا کرتے تھے -

شہزادوں کی تعلیم و تربیت کے لئے خاص اساتذہ مقرر تھے محمدؐ، محمود، اور داؤد، تینوں شہزادوں کی تعلیم مولانا

فضل اللہ انجو کے تفویض تھی اور مولانا کے زیر نگرانی اساتذہ آکر پڑھایا کرتے تھے۔

مدارس کا اعلیٰ انتظام تھا، ایلچ پور (برار) میں ایک دار العلوم کھولا گیا تھا جس کا ایک وسیع دار الاقامہ بھی تھا اس کے اخراجات کے لئے سالانہ تیس ہزار ہون آمدنی کی جاگیر وقف تھی (ہون مثادی ہے ۳½ روپیہ کلدار) اس کے علاوہ دولت آباد، گلبرگہ، بو غیرہ میں بہت سے مدارس قائم تھے۔ طلباء کو وظائف نہیں دئے جاتے تھے بلکہ اُن کے خورد نوش کپڑے لتے کا ذمہ دار مدرسہ ہوا کرتا تھا۔ مدرسین کی تنخواہیں معقول تھیں۔

حسن کو فنون سپہگری سے خاص شغف تھا اس نے ہر محلے میں ورزش خانے بنوا دئے تھے جہاں فنون سپہگری کی مشق کیجاتی اور تعلیم دیجاتی تھی، امراء کے لڑکوں کو تعلیم گاہوں میں جاکر کشتی، تلوار، بنوٹ وغیرہ سیکھنے کے لئے خاص تاکید تھی، شیر و شکار کا بھی بہت شوق تھا گلبرگہ کے اطراف صحرائے محصورہ اس کے شکار کے لئے مخصوص تھا، اکثر شکار کو جایا کرتا تھا آخر اسی شکار کا شکار ہوا اور ایسا شکار کرتے گیا کہ مرض الموت میں مبتلا ہو کر واپس آیا۔

امراء دربار کو جاگیریں اور منصبین دے رکھی تھیں اور ہر طرح امراء کی دلجوئی کیا کرتا تھا۔

ٹپہ کا انتظام نہایت اعلیٰ پیمانے پر تھا، اور یہی انتظام اکبر کے زمانے میں بھی قایم رہا،

شرح مالگزاری نہایت ہی خفیف مقدار میں وصول کیجاتی تھی، ٹیکس بہت کم تھے اور بہ مقدارِ قلیل وصول کئے جاتے تھے زراعت کی حالت اچھی تھی تجارت بھی اعلیٰ پیمانہ پر تھی، صنعت و حرفت کو بہت عروج تھا، گلبرگہ میں پارچہ بانی کے کارخانے قایم تھے۔

سکہ۔ ہوں، تنگہ، وغیرہ کے نام سے متفرق سکے رائج تھے اس نے اپنے سکہ پر عبد معبود محمد محمود سلطان اعظم علاء الدنیا والدین "جانب راست"، اور "المؤید بنصر اللہ ضرب فی حسن آباد" جانب چپ کندہ کرایا تھا، حسن، متوسط قامت، قوی ہیکل، سرخ رنگ، چالاک و چست، پر رعب، بہادر، خوش اخلاق ملنسار، ہمدرد، منکسر المزاج غریب الطبع، امانت دار مستقل مزاج تھا۔

بعض مورخین نے اس کی اولیات کی ایک طویل فہرست گنائی ہے۔ جس میں سے چند یہ ہیں،

دکن میں سب سے پہلے اسلامی سلطنت قایم کی، ہندوستان اور دکن میں سب سے پہلے برہمن گانگو پنڈت کو ملازم رکھا سلاطین دکن میں صرف حسن ہی ایک ایسا بادشاہ تھا جس کی بیوی صرف ایک ہی تھی، اسی نے منصبداری دستار ایجاد کی، رسم ستی کو کم کر کے اس کو بند کرنے کی کوشش کی مسلم اور غیر مسلم مردوں اور عورتوں کو آپس میں بیاہ دیا، دکن میں متعدد مندر بنائے اور ان کے اخراجات کے لئے جاگیرات وقف کیں، برہمنوں پجاریوں، وغیرہ کے لئے معاش مقرر کی۔

حسن کا مزار گلبرگہ میں قلعہ کے پیچھے واقع ہے جس پر ایک خوبصورت مختصر گنبد بنا ہوا ہے جو نہایت ہی خستہ حالت میں ہے۔

سلطان محمد شاہ بہمنی | ۲ ربیع الاول ۷۵۹ھ کو سلطان محمد شاہ بہمنی نے تخت سلطنت پر بڑی دھوم دھام کو جلوس کیا

حضرت شیخ سراج الدین جنیدی نے اپنے دست مبارک سے تلوار باندھی اور امراء و وزراء نے نذریں دیں۔

محمد شاہ نے ممالک محروسہ بہمنیہ کو چار حصوں میں تقسیم کر دیا۔ (۱) گلبرگہ، (۲) دولت آباد، (۳) تلنگانہ، (۴) برار اسوقت تک دکن میں سکوں کا رواج نہ تھا مگر اُس نے طلائی سکے بنوائے جن کے ایک رُخ پر کلمہ طیبہ اور صحابۂ اربع کے اسمار گرامی اور دوسری طرف اپنا نام اور سنہ جلوس کندہ تھا۔

حسن نے جس نقرئی تخت پر جلوس کیا تھا اسی پر محمد شاہ نے بھی جلوس کیا، مگر ایک آبنوسی طلا کار تخت راے تلنگانہ نے شہنشاہِ دہلی کے لئے بنوایا تھا جو محمد شاہ کو تحفتہً دیدیا محمد شاہ نے اس کا نام "تخت فیروزہ" رکھکر اسی پر بیٹھنا شروع کیا اور یہ تخت سو برس تک خاندان بہمنیہ میں رہا، اور حسن کا بنوائی ہوائی نقرئی تخت فیروز شاہ کے عہد میں مدینۂ منورہ روانہ کر دیا گیا۔ محمد شاہ کی والدہ ملکۂ جہاں نے بیت اللہ کا ارادہ کیا تو محمد شاہ نے تمام خزانہ ساتھ کر دیا کہ سادات کو تقسیم کر دیا جائے، امراء و وزراء نے بہت مخالفت کی کہ خزانہ میں کچھ تو رکھئے مگر محمد شاہ نے ایک نہ سنی اور خزانہ روانہ کر دیا ملکۂ جہاں نے حج سے فارغ ہو کر تمام خزانہ سادات کو بانٹ کر واپسی کا ارادہ کیا تو محمد شاہ نے بڑے کروفر سے استقبال کیا اور ایک بڑا بھاری جشن ترتیب دیا محمد شاہ نے اپنا باڈی گارڈ مقرر کیا اور اس کے چار حصے مقرر کر دئے (۱) سلحدار (۲) سرخیل (۳) جوانانِ یکہ (۴) باردار، روزانہ پچاس سوار دو ہزار خاصہ خیل، نوبت بہ نوبت حاضر در دولت رہا کرتے تھے، امراء و منصبداروں کے چوکی پہرے بھی مقرر کر دئے گئے تھے اور قدیم عہدہ داروں میں کچھ تغیر کر کے حسب ذیل خدمات قایم کی تھیں،

ملک سیف الدین غوری	وکیل سلطنت ملک نائب	بایزید خاں سسانی	افسر خاصہ خیل
بہادر خاں بن اسمٰعیل	امیر الامراء	کلیم اللہ خاں مازندرانی	افسر جوانان یکہ
مقرب خاں بن صفدر خاں	میر آتش	سید شریف سمرقندی	صدر
موسیٰ خاں افغان	افسر میمنہ	ملا محمد بن عین الدین	مفتی عسکر
عیسیٰ خاں	افسر میسرہ	محمود افغان	افسر سلحداراں
محمد اسمٰعیل ناعطہ	داروغہ جواہر خانہ	سید جلال حمید	مصاحب
ملک محمود	خوان سالار	شاہ ملک غوری	مصاحب
ملا محمد مشہدی	میر ساماں	"	"

سب سے پہلے محمد شاہ نے در دولت پر نوبت مقرر کی اور پانچ وقت نوبت نوازی ہونے لگی جس کا رواج اب تک دکن میں ہے ہر جمعہ کو صبح سے دوپہر تک دربار عام کیا کرتا تھا، اور ہر ایک شخص کی شکایات سنتا تھا۔

تمام مشائخینِ دکن نے محمد شاہ کے ہاتھ پر بیعت کی مگر شیخ زین الدین دولت آبادی نے صاف انکار کر دیا کہ "بادشاہ شراب خوار ہے اور دار السلطنت میں شراب فروخت ہوتی ہے میں ایسے شخص کی بیعت نہ کرونگا" محمد شاہ کو بہت ناگوار گزرا اور اس نے شیخ کو شہر سے نکل جانے کا حکم دیا، شیخ زین الدین مصلےٰ کندھے پر ڈال کر شہر سے نکلے اور برہان الدین غریبؒ کے روضۂ منورہ پر جاکر ٹھیرے اور فرمایا "دیکھیں یہاں سے ہمیں کون اٹھاتا ہے" شیخ کی ثابت قدمی دیکھکر محمد شاہ کے خیالات بدل گئے صدر الشریف کو روانہ کرکے معافی مانگی۔ شیخ نے فرمایا اگر بادشاہ شریعت محمدی کا لحاظ کرے اور توبہ کرے اور شراب خانہ اٹھوا دے تو پھر بادشاہ کا کوئی دوست ہم سے زیادہ نہ ہوگا ورنہ کچھ نہیں۔ ہمارا تو یہ نصب العین ہے۔

تا من بزیم بجز نکوئی نکنم — جز نیک دلی و نیک خوئی نکنم
آنہا کہ بجائے ما بدیہا کردند — تا دست رسد بجز نکوئی نکنم

یہ سنکر محمد شاہ نے توبہ کرلی اور ممالک محروسہ سے دوکانیں اٹھوا دیں اور بالکل پابند شریعت ہوگیا۔

ابھی محمد شاہ انتظامات سلطنت سے فارغ بھی نہیں ہوا تھا کہ رایاں بیجانگر و تلنگانہ نے قلعہ جات رائچور، مدگل وغیرہ مطالبہ شروع کیا اور قلعہ کولاس کی واپسی کا مطالبہ بھی ہونے لگا۔ ادہر صرافانِ دکن نے بہمنیہ طلائی اور نقرئی سکوں کو گلانا شروع کر دیا سلطنت بیجانگر اور تلنگانہ کے ایلچی مطالبات لیکر گلبرگہ آگئے، محمد شاہ نے انہیں کوئی جواب نہیں دیا اور انہیں ٹھیرا لیا۔ گلبرگہ میں ایک خفیہ پارٹی بادشاہ کے خلاف ہوگئی، یہ ایسی افتاد تھی کہ اگر محمد شاہ کے بجائے کوئی اور ہوتا تو پریشان ہوکر بھاگ کھڑا ہوتا مگر محمد شاہ نے نہایت ہی اطمینان سے پہلے تو اپنی مخالف پارٹی توڑ دیا اور پھر تمام صرافوں کو نہایت ہی سختی سے قتل کر دیا۔ جب ان چیزوں سے فرصت ہوئی تو دربار عام کرکے ایلچیوں کو طلب کیا اور کہا کہ "رایوں نے اب تک پیشکش و نذرانہ نہیں دیا ہے یہ رقم فوراً داخل خزانہ کر دیجائے" ایلچیوں نے بادشاہ کا حکم رایاں بیجانگر اور تلنگانہ کو پہونچا دیا اور انھوں نے ایک زبردست لشکر سپہ سالار ناگ دیو اور نانک رام کی سرکردگی میں کولاس روانہ کر دیا۔ محمد شاہ نے یہ اطلاع پاکر بہادر خاں بن اسمٰعیل مخ کو ایک مختصر سا لشکر دیکر مقابلہ کے لئے روانہ کیا۔ جس نے پہونچکر نہایت ہی جی داری سے مقابلہ کیا اور راجۂ ورنگل سے خراج و تحائف لیکر واپس ہوا۔

سنہ ۷۶۳ھ میں چند سوداگر گھوڑے لا رہے تھے جو محمد شاہ نے منگوائے تھے جب وہ ورنگل پہونچے تو ناگ دیو نے چھین لئے اور سوداگروں نے اس کی اطلاع بادشاہ کو دی، اطلاع پاتے ہی محمد شاہ ایک ہزار سوار لیکر بجلی کی طرح ورنگل پہونچ گیا اور قلعہ پر قبضہ کر لیا، ناگ دیو قلعہ سے باہر ایک باغ میں شراب پی کر مست پڑا ہوا تھا۔ محمد شاہی فوج نے اسے گرفتار کر لیا اور قلعہ کے سامنے آگ جلا کر پھونک دیا۔ محمد شاہ نے پندرہ روز تک وہیں ٹھہر کر جشن منایا۔ جب رایانِ تلنگانہ کو اس کی اطلاع ملی تو انھوں نے تعاقب کیا۔ محمد شاہ لڑتے بھڑتے ہوئے واپس ہونے لگا مگر بہت نقصان اٹھانا پڑا بازو پر گولی کا شدید زخم لگا اور صرف پندرہ سو آدمی گلبرگہ تک پہونچ سکے۔

سنہ ۷۶۳ھ میں رائے تلنگانہ نے فیروز شاہ دہلی کو لکھا کہ ہم ایکا کرکے آپ کی مدد کرتے ہیں آپ حکام مالوہ اور گجرات کو دکن پر چڑہائی کا حکم دین مگر فیروز شاہ کو اپنے کاموں سے فرصت نہ تھی وہ دکن پر کیا چڑہائی کرتا اس نے جواب نہ دیا مگر جب یہ خبر محمد شاہ کو ملی تو وہ آگ ہوگیا اور اپنے لشکر کے دو حصے کرکے ایک ورنگل اور ایک گولکنڈہ روانہ کردیا اور دونوں طرف لشکر کامیاب رہا۔ راجۂ ورنگل نے ایک بیش بہا مرصع تخت اندازاً چالیس لاکھ قیمت کا اور بے شمار زر وجواہر دیکر پیچھا چھڑایا اور گولکنڈہ بھی محمد شاہ کے ہاتھ آیا۔ سنہ ۷۶۴ھ ۱۳۶۳ء میں ورنگل پر بھی محمد شاہ کا قبضہ ہوگیا اور دریائے کرشنا کا تقریباً کل حصہ سلطنت بہمنیہ میں داخل ہوگیا

سنہ ۷۶۵ھ میں محمد شاہ اور رائے بیجانگر میں ایک باقاعدہ لڑائی ہوئی جسمیں نہ تو مصالح ملکی مدنظر تھے اور نہ کوئی مذہبی خیال تھا صرف محمد شاہ کو اپنے حکم کی تعمیل کرانی منظور تھی، ملا داؤد بیدری جو محمد شاہ کا مہردار تھا اس جنگ کی تفصیل اس طرح بیان کرتا ہے،

"ایک روز محمد شاہ بہمنی جلسۂ رقص وسرود میں بیٹھا ہوا تھا کہ قوالوں نے امیر خسرو کے دو شعر گائے جسے محمد شاہ نے بہت پسند کیا اور ملک سیف الدین غوری کو حکم دیا کہ ان تین سو قوالوں کو انعام دینے کے لئے ایک برات راجہ بیجانگر کے نام لکھدی جائے۔ ملک سیف الدین نے اسیوقت برات لکھ دی مگر اس خیال سے کہ بادشاہ نے نشہ میں ایسا حکم دیدیا ہے ممکن ہے کہ بعد کو خیالات بدل جائیں برات روانہ نہیں کی، دوسرے روز بادشاہ نے دریافت کیا برات روانہ کردی گئی" تو سیف الدین نے جواب دیا نہیں" یہ امر محمد شاہ کو بہت ناگوار گزرا کہا "کیا تو خیال کرتا ہے کہ کوئی لغو اور مہمل حکم مابدولت کی زبان سے نکل سکتا ہے ہم نے نشہ میں حکم نہیں دیا بلکہ جو کچھ کہا گیا سمجھ بوجھ کر کہا گیا ہے" غوری نے فوراً برات پر مہر کی اور ایک معتبر شخص کے ہاتھ برات بیجانگر روانہ کردی گئی۔

رائے بیجانگر نشۂ حکومت میں چور تھا وہ کسی کو اپنے مقابلہ کا خیال ہی نہیں کرتا تھا حکم کی تعمیل تو اور بات ہے اس نے قاصد سے برات لیکر اس کی تشہیر کی اور گدھے پر بٹھلا کر تمام شہر میں پھرایا اور ذلیل کرکے نکلوا دیا۔ اور تمام فوج ساتھ لیکر بیجانگر سے چل پڑا تیس ہزار سوار، تین ہزار ہاتھی، نو لاکھ پیدل سے قلعہ اوہوتی پر یورش کی اور تمام علاقہ لوٹ لیا۔ اور مدگل پہونچکر قلعہ پر بھی حملہ کردیا۔ یہاں کا داروغہ ملک سیف الدین غوری کا ایک عزیز اور نہایت ہی سخت آدمی تھا، قلعہ پر آٹھ سو جوان محافظت کے لئے تھے مگر داروغہ کی سختی کی وجہ سے بددل تھے، اسی بددلی کی وجہ وہ لوگ مقابلہ نہ کرسکے اور راجہ نے مدگل پر قبضہ کرلیا، تمام باشندے قتل کردئے گئے حتیٰ کہ زن ومرد میں کوئی باقی نہ رہا صرف ایک مسلمان نہ جانے کہاں چھپ رہا تھا کہ راجہ کے سپاہیوں کی وردی پہن کر مدگل سے نکلا اور گلبرگہ پہونچکر سارا حال کہہ سنایا بادشاہ یہ خبر سنکر آگ ہوگیا اس خبر لانے والے کو یہ کہکر قتل کرادیا کہ "میں ایسے منحوس کی صورت نہیں دیکھنا چاہتا جو تمام بہادروں کو کٹتے مرتے دیکھ کر اپنی جان بچاکر بھاگ آئے" اسی دن جمادی الاول سنہ ۷۶۷ھ کو قسم کھائی کہ جب تک آٹھ سو مسلمانوں کے خون کے عوض ایک لاکھ ہندؤں کو قتل نہ کرونگا تلوار نیام نہ کرونگا۔ اور کشت وخون سے ہاتھ نہ روکوں گا" اسی دن گلبرگہ سے روانہ ہوگیا اور جب رود کرشنا پر پہونچا تو مغلظہ قسم کھائی کہ جب تک خداوند کریم کے فضل وکرم سے دریا عبور کرکے لشکر کفار کو نیست ونابود نہ کرونگا اور مسلمانان مدگل کے خون کا بدلہ لیکر دل نہ ٹھنڈا کروں خواب وخور حرام ہے" اپنے بیٹے کو جانشین بناکر وصیت تک کردی اور ملک میں سیف الدین

غوری کو نائب السلطنت مقرر کرکے گلبرگہ روانہ کردیا اور صرف خاصہ کے بیس ہاتھی اور نو ہزار سوار ساتھ لیکر کرشنا کے پار جا اترا۔

بادشاہ کا حال سنکر رائے بیجانگر کو بہت پریشانی ہوئی اس نے خزانہ وغیرہ روانہ کرکے خود بھی قرار پر فرار کیا، مگر رات میں بارش ہوچکی تھی راستہ خراب تھا بہ مشکل چار میل ہی گیا ہوگا کہ محمد شاہ لئے ہوئے آ پہونچا اور پہلے ہی حملے میں ستر ہزار زن و مرد اور بچے قتل کرئے۔ دو ہزار ہاتھی تین ہزار توپیں اور بندوقیں، سات سو عربی النسل گھوڑے ایک منزل سنگاسن (پالکی) مرصع داخل خزانہ ہوئی اور بقیہ لوٹ امراء اور فوج کو ملی، محمد شاہ نے موسم برسات مدگل ہی میں بسر کیا جب خان محمد دار السلطنت سے فوج لیکر آیا تو اُسے ادھونی روانہ کردیا اور ہر دیو رائے نے اپنے بھانجے کو سپہ سالار بناکر قلعہ میں چھوڑا۔ اور خود بیجانگر سے فوج ہاتھی اور لوازم شاہی منگواکر قلعہ کے باہر ٹھہر گیا۔ بادشاہ نے بھی توپیں اور بندوقیں زیادہ تعداد میں منگوائیں اور ایک آتش باری کا نیا کارخانہ قایم کیا جس کا رواج اب تک نہ تھا یہ اسی کی ایجاد تھی مقرب خان سیتانی کو اس کا افسر مقرر کیا اور رومی اور فرنگی سپاہی کا کام کرنے کے لئے مقرر کئے گئے۔

ریاست بیجانگر پر چڑھائی کا یہ بالکل پہلا موقع تھا اس لئے محمد شاہ کو پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑا، مگر اس پر بھی محمد شاہ نے تنگ بھدرا کو عبور کرکے تخمیناً پچیس میل آگے بڑھ کر یاکل کوتال پر بیجانگر کی فوج سے مقابل ہوا، کیونکہ محمد شاہ کے دریا پار اُترنے کی اطلاع جب "بکا رائے" بیجانگر کو ملی تو اس نے امراء کے مشورے سے بھوج مل کو سپہ سالار مقرر کرکے چالیس ہزار سوار اور پانچ لاکھ پیدل دیکر محمد شاہ کے مقابلہ کے لئے روانہ کردیا۔ بھوج مل کو سپہ سالاری کا عہدہ پاکر ایسی مسرت ہوئی کہ اپنے آپ کو بھول گیا اور راجہ سے پوچھنے لگا "مہاراج کا کیا حکم ہوتا ہے آیا بادشاہ کو زندہ قید کرکے حاضر کروں یا اس کا سر کاٹ کر لاؤں"، راجہ نے کہا۔ زندہ دشمن تو ہر حال میں خطرناک ہے بہتر تو یہ ہے کہ تم اس کو جسوقت گرفتار کرو فوراً "مار ڈالو" بھوج مل خوشی خوشی روانہ ہوا اور اس نے یہ ایک اور ترکیب سوچ لی کہ چند برہمنوں کو اس واسطے مقرر کردیا کہ لشکر میں مسلمانوں کے مظالم بیان کرکے سپاہیوں کو جوش میں لائیں۔ برہمن تو مسلمانوں پر خار کھائے بیٹھے تھے۔ انھوں نے دل کھول کر مسلمانوں کے مظالم بیان کرنے شروع کئے اور ایسے وعظ کئے کہ مسلمانوں کی طرف سے ہندوؤں کے دل میں جذبات منافرت کی طغیانی ہونے لگی اور ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوگئے۔ محمد شاہ کو جب بھوج مل کے آنے کی اطلاع ملی تو اس نے پندرہ ہزار سوار اور پچاس ہزار پیدل خود رکھکر اور دس ہزار سوار اور تیس ہزار پیدل اور توپ خانہ دیکر خان محمد کو مقابلہ کے لئے روانہ کردیا

پنجشنبہ ۱۴ ذیقعدہ ۷۶۷ھ کی صبح سے مقابلہ شروع ہوا شام تک دونوں فوجیں آپس میں گتھی رہیں عیسٰی خاں اور موسیٰ خاں میمنہ اور میسرہ پر لڑتے ہوئے شہید ہوئے اور انکی فوجیں منتشر ہونے لگیں قریب تھا کہ فوج کے قدم اکھڑنے لگیں کہ بادشاہ خود تین ہزار سوار لیکر پہونچ گیا۔ محمد شاہ کو دیکھتے ہی خان محمد کی ہمت بندھی اور منتشر شدہ فوج لیکر حملہ کردیا، مقرب خاں بھی توپ خانہ لیکر آگے بڑھا، تمام افسران فوج نے اکٹھا ہوکر ہلا کیا۔ ہندو روک نہ سکے اور آپس میں گتھ گئے

دست بدست لڑائی ہونے لگی، اتفاق سے محمد خاں کا ہاتھی "شیر شکار" بدل گیا اور مہاوت کے قبضہ سے نکل کر سیدھے قلب لشکر میں جا گھسا، بھوج مل کے ہاتھیوں نے روکنا چاہا مگر وہ کب رکتا تھا اسی گڑبڑ میں مہاوت بھی مارا گیا اور شیر شکار مطلق العناں ہوکر روندنے لگا خان محمد نے بھی پانچ ہزار سوار لیکر قلب پر حملہ کر دیا، شیر شکار بھی اپنے مالک کو دیکھکر اس کی طرف آیا اور دشمنوں کو پامال کرنے لگا۔ بھوج مل زخمی ہوکر بھاگا اور اس کو بھاگتے دیکھکر لشکر کے قدم بھی اُکھڑ گئے، محمد شاہ نے قتل عام بول دیا۔ اب کیا تھا مرد تو مرد عورتیں اور بچے بھی تہ تیغ کئے گئے، کامل فتح ہوئی اور محمد شاہ نے اسی میدان میں ڈیرے ڈال دیئے اور ایک ہفتہ قیام کرکے آگے بڑھا رائے بیجانگر باوجود فراوانیٔ لشکر کے ایسا گھبرایا کہ پہاڑوں اور جنگلوں میں چھپ گیا محمد شاہ بھی اپنی بات کا دھنی تھا تین مہینہ تک کوہ وصحرا میں پیچھا کرتا رہا، اور راجہ کو گھیر کر قلعہ کی طرف لایا۔ ایک مہینہ تک راجہ قلعہ بند اور بادشاہ محاصرہ کئے رہا مگر بیٹھے بیٹھے محمد شاہ کو ایک نئی چال سوجھی یکایک بستر علالت پر دراز ہوگیا اور اپنی شدید علالت کی خبر مشتہر کرادی، یہ ایک راز تھا جس سے خان محمد اور مقرب خاں کے سوائے کوئی واقف نہ تھا۔ رائے بیجانگر کو اس خبر سے بڑی مسرت ہوئی اور وہ قلعہ کے باہر نکل پڑا، بادشاہ پیچھے ہٹنے لگا اور راجہ تعاقب کناں ساتھ ہوگیا، بادشاہ سنگھاسن میں لیٹا ہوا سفر کرتا تھا تمام لشکر پریشان ساتھ ساتھ تھا اسیطرح دریائے تنگبھدرا کو عبور کرکے ایک میدان میں قیام کیا۔ دو تین کوس کے فاصلہ پر راجہ نے بھی ڈیرے ڈال دیئے، راجہ بالکل بے سروسامانی کے ساتھ شاہی لشکر کو دباتا ہوا آگیا تھا جب محمد شاہ نے دیکھا کہ موقع اچھا ہے تو ایک دن دربار عام کیا اور دس پندرہ منٹ بیٹھ کر دربار برخواست کر دیا، اس سے فوج میں ہمت آگئی اور رات کے بارہ بجے لشکر کو تیار رہنے کا حکم دیا اور خود بھی تیار ہوکر راجہ کے لشکر پر شبخوں مارا تمام ہندو بے خبر پڑے سو رہے تھے جب مسلمانوں نے سر پر پہونچکر قتل عام شروع کیا تو یہ بیدار ہوئے مگر مسلمانوں کی تلوار سے پناہ پانی مشکل تھی۔ رائے بیجانگر تو اپنی جان مٹھی میں لیکر چلتا بنا مگر دس ہزار آدمی کام آئے، اسپر بھی محمد شاہ کا تیش کم نہ ہوا، بیجانگر کے اطراف چالیس چالیس کوس تک قتل عام کر دیا، دس ہزار برہمن قتل ہوئے اور قلعہ کے اطراف رعایا کا پتہ نہ رہا اور فوج تو نام کو بھی باقی نہ تھی۔

ادھر ہندو بے انتہا پریشان تھے تمام امرا و وزرا نے اس قتل عام کو رائے بیجانگر کے سر تھوپا کہ محض تیری وجہ اور تیری ہی خود سری اور شعلہ مزاجی کے کارن یہ دن دیکھنا نصیب ہوا ہم نے علاؤالدین سے صلح کرلی تھی تو نے ذرا سی بات کے واسطے لڑائی مول لی، اب نہ تو تو رہیگا اور نہ سلطنت کا نام ونشاں ہی باقی رہیگا، اب بھی مصالحت کرلے تو اچھا ہے، اسیوقت راجہ نے ایک ایلچی روانہ کیا اور معذرت سے عفو تقصیر چاہی مگر بادشاہ نے صاف انکار کر دیا۔ امرائے بہمنیہ بھی لڑائی سے تنگ آگئے تھے ایک پیش رفتہ من چلے امیر نے عرض کی کہ حضرت نے آٹھ سو مسلمانوں کے بدلے میں ایک لاکھ ہندوؤں کو قتل کرنے کی قسم کھائی تھی اور وہ پوری بھی ہوگئی، مگر یہ قسم نہ تھی کہ روئے زمین پر کے تمام ہندو قتل کئے جائیں گے۔ یہ سنکر محمد شاہ ہنس پڑا اور کہنے لگا تم سچ کہتے ہو مگر مجھے اپنی بات کی لاج ہے۔ جب تک رائے بیجانگر میرے حکم کی تعمیل نہ کریگا

اور قوالوں کو رقم نہ دیگا میں مصالحت نہ کرونگا، ایلچی نے فوراً قوالوں کو رقم ادا کردی اور جب محمد شاہ نے قوالوں کو رقم دیجاتی ہوئی اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تو کہنے لگا "میں نہیں چاہتا کہ کوئی حکم میری زبان سے ایسا لغو نکلے جس کی تعمیل نہ ہو سکے۔ اور آگے چل کر میری سبکی ہو الحمد للہ میرا حکم پورا ہوا۔"

محمد شاہ کی اس عدیم النظیر سخن پروری کو ہم بھی وقعت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں مگر اتنی سی بات کو افسانہ کر دینا اور ایسا کشت وخون ذرا رکیک ضرور ہے

ایلچیوں کے معروضہ پر بادشاہ نے عہد کیا کہ آئندہ کسی جنگ میں فتح کے بعد کسی ہندو کو قتل نہ کیا جائے گا۔ مگر اس کی پابندی نہ تو خود محمد شاہ نے کی اور نہ اس کے جانشینوں نے چند ہی روز کے بعد یہ عہد بھلا دیا گیا۔

مصالحت کے بعد محمد شاہ گلبرگہ آگیا مگر اس وقت بیجانگر کی حالت بڑی تھی پانچ لاکھ ہندو تہ تیغ ہو چکے تھے، اور کوسوں تک ویرانا ہی ویرانا نظر آتا تھا مدت تک بیجانگر سنبھل نہ سکا۔

محمد شاہ نے جسوقت اپنی علالت کی خبر اڑائی تو بہرام خاں مازندرانی نے بغاوت کردی گلبرگہ پہونچکر بادشاہ کو اطلاع ملی تو اس کی سرکوبی کے لئے تیار ہونے لگا، مگر وہ گجرات بھاگ گیا جس کی وجہ ایک فتنۂ عظیم فرو ہو گیا۔

۱۹ ذیقعدہ ۷۷۶ھ کو سترہ سال نو مہینے سات دن حکومت کرکے ۴۵ سال کی عمر میں محمد شاہ نے انتقال کیا۔

چون محمد شہ زمین و زماں | جست زیں دار و دل بہ جنت راہ
شاہِ ملت بگو بہ اس نیز | اہل دیں مرد دیں محمد شاہ
۷۷۶ھ | ۷۷۶ھ

محمد شاہ دشمنوں کے لئے نہایت ہی سخت گیر اور اپنی رعایا اور فوج کے لئے نہایت ہی ذی خلق تھا۔ نہایت ہی عقیل، شجیع فہیم، الوالعزم، اور عالی حوصلہ تھا۔ ٹھگوں اور ڈاکوؤں کا قلع و قمع کر دیا اس کے زمانہ میں آٹھ ہزار ڈاکو گرفتار کئے جا کر قتل کئے گئے تھے ایک دفعہ سارا خزانہ بیت اللہ کو روانہ کر دیا مگر بعد میں اس کے ہاں اس قدر خزانہ جمع ہوا کہ دوسرے کسی بادشاہ کو اتنی دولت میسر نہ آ سکی۔ اس کی اولاد سے ایک بیٹا مجاہد شاہ اور ایک بیٹی روح پرور آغا تھی۔

باقی ــــــــ باقی

تمکین کاظمی

تصویر رقاصہ
قیمت صرف ۴ر
منیجر نگار لکھنو

تصویر زیب النساء بیگم
قیمت صرف ۸ر
منیجر نگار لکھنو

قابل رشک خودکشی

(فسانہ)

عورت کی فطرت کے متعلق لوگ کہتے ہیں کہ "عقدۂ لاینحل ہے"۔ باوجود اس کے ان کی کوشش ہمیشہ یہ جاری رہی ہے کہ اس معمہ کا حل اس بحر بے پایاں کا کنارہ دریافت کرلیں۔ مگر انھیں نہیں معلوم کہ ایک مرد کے لئے عورت کی خواہش اس کی محبت کا پُرکیف خیال، اور اس کو مقصود زندگی سمجھنا اسیوقت تک ہے جب تک کہ وہ اس کی فطرت سے ناواقف و ناآشنا ہے۔ عورت کی فطرت کو سمجھ لینا تباہ و برباد ہوجانے کے مترادف ہے۔ پھر کیوں اک عالم اپنی موت کی پیچھے پڑا ہوا ہے اسی قسم کی ایک بربادی کا واقعہ سنئے:۔

میں مصور پیشہ تھا۔ سب کا خیال تھا کہ میں دنیا کا بہترین مصور ہوں...... مصوری میرے ایسے شخص ہی کی محتاج تھی جو اس کو اس کی اصلی شکل میں دنیا کے آگے پیش کرسکتا تھا۔ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ مصور حقیقی اپنے بنائے ہوئے قانون کے تحت اسباب پر مجبور ہے کہ کسی تصویر کو "جذبۂ رنج" دے تو "جذبۂ خوشی" بھی دے۔ اضطراب دے تو سکون بھی دے۔ مگر مصور مجازی کی (یعنے میری) بنائی ہوئی تصویریں اس قید و بند سے آزاد صرف ایک ہی قسم کے جذبات کی حامل ہوتی ہیں اور وہ جذبات کامل سوز، یکسر گداز، محو کن محویت، مسرت بخش استغراق کے سوا کچھ نہ تھے۔ جب یہ خیالات مجھکو...... معلوم ہوتے تو ایک طرف اپنی ذات کے متعلق تعجب ہوتا اور دوسری طرف ان کلمات کی صداقت کا یقین۔ غرض میری مصوری کا ستارہ ایسے عروج پر تھا جس کے بعد زوال کا ہونا لازمی ہے۔ ایک روز میں کام کرنے کے بڑے کمرہ میں بیٹھا ہوا شہر کے ایک بڑے نواب کی تصویر پر نکتہ چین نگاہ ڈال رہا تھا جو میں نے کافی معاوضے اور مناسب التجا پر تیار کی تھی گھنٹی بجی۔ میرا مددگار ٹیلیفون کی طرف بڑھا، واپس آکر کہنے لگا مس لیلی صاحبہ نے کہا ہے کہ وہ پرسوں شام اپنی تصویر کھچوانے کے متعلق بات چیت کرنے آئیں گی۔ میں اچھل پڑا...... بیشک میں ہمیشہ کسی دولتمند کی خواہش تصویر کشی پر مسرت سے اچھل پڑتا تھا، کیونکہ مجھے ایسی صورت میں ہمیشہ قیاس سے کہیں زیادہ مالی فائدہ ہوچکا ہے۔ مگر میرا اسوقت چونک پڑنا خوشی سے نہیں بلکہ آنے والے...... "حادثۂ عظیم" کے خیال سے تھا۔ دنیا جانتی ہے کہ لیلی حسین عورت ہے اور کنواری، زہریلی ناگن ہے اور آزاد آگ کا شعلہ ہے اور کھلی ہوا ہیں۔ بیسیوں ہستیاں اس کی لپیٹ میں تباہ ہوچکی ہیں اور بیسیوں ایک ملاقات کے معاوضہ میں زندگی دینے کے لئے تیار۔

میں نے اپنی طبیعت کے خلاف اپنے مددگار سے بگڑکر کہا...... کیوں نہ کہدیا کہ مصروفیت زیادہ ہے، دو ماہ تک نیا آرڈر نہیں لیا جاسکتا۔ ساتھ ہی خیال آیا "اس غریب کو کیا معلوم کہ میں کسی خاص وجہ سے لیلی کی تصویر بنانا پسند نہیں کرتا۔

مددگار نے کہا "معاف فرمائیے اب کہہ نہ دوں کہ مجبوری ہے"۔ میں "ہاں" کہنا چاہتا تھا مگر چونکہ "ہاں" کہنا تقدیر کے خلاف تھا اس لئے نہ کہہ سکا۔ میں نے مددگار سے، جو آیا کہا کہ "ضرورت نہیں۔ اپنا کام کرو"۔ اس قیامت صغریٰ سے اس قیامت کبریٰ (یعنی آنے والے مصیبت کے دن) تک میں جس قدر بے چین و بیتاب رہا اس کا اندازہ کرنا محال اور تمثیل پیش کرنا ناممکن ہے۔ اگرچہ میں مرد تھا اور مضبوط جسم و دل کا مالک ۔ مگر سمجھ میں نہ آتا تھا کہ جب کبھی لیلیٰ سے ملنے کا خیال آتا تھا میرے ہاتھ پاؤں کیوں مرتعش ہو جاتے تھے۔ اور دل کی آواز کیوں صاف سنائی دیتی تھی ۔ میں وقت کو روک لیتا اگر روک سکتا .... اس وقت تک کہ دنیا فنا ہو جاتی اور مجھے یہ "روز بد" دیکھنا نہ پڑتا۔ مگر ایسا ممکن ہونا ممکن نہ تھا۔ آخر وہ دن آپہونچا۔

مجھے صفائی اور خوش پوشی زیادہ پسند تھی..... اس لئے ایک سولی پر چڑھنے والے شخص کی طرح اپنی ہر دو خواہشات کی تکمیل کر لی غسل سے فارغ ہو کر نیلے رنگ کے سرج کا سوٹ پہنا اور کام کرنے کے "ہال" میں ہر آنے والی مصیبت کے لئے تیار آبیٹھا۔ جوں جوں وقت قریب آتا تھا بےچینی زیادہ ہوتی جاتی تھی۔ مگر یہ بے چینی "آتشِ شوق" کی نہ تھی۔ گھڑیال نے ساڑھے چار کا گھنٹہ بجایا.... ساتھ ہی کمرہ کی "اطلاعی گھنٹی" بجی ۔ مددگار نے قاعدہ کے موافق دوسرے کمرہ میں جاتے ہوئے لیلیٰ کو میرے کمرہ میں بھیجدیا ۔ میں عمداً سر جھکائے ہوئے ایک تصویر کے مطالعہ میں مشغول تھا، میں نے پہلے دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آوازیں سنیں، پھر میری طرف بڑھتے قدموں کی ہلکی چاپ سنائی دی، پھر بھی میں بیٹھا رہا۔ ایک سریلی آواز یہ کہتے ہوئے سنائی دی.... معاف فرمائیے.... شاید آپ کو میرے آنے کی اطلاع نہیں ہوئی۔ میں چاہتا تھا کہ مصنوعی اضطراب ظاہر کر کے اُٹھوں، مگر جوں ہی میں نے نظر اٹھائی اور دیکھا اضطراب طاری کرنے کی بجائے رفع کرنا مشکل ہو گیا، میں نے کہا خبر تو ہو گئی تھی مگر آپ کے واقعی تکلیف فرمانے کا یقین نہ تھا، میں اس بارہ میں ادب کے ساتھ معافی چاہتا ہوں۔ لیلیٰ نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے میرا فقرہ پورا کیا" باوجودیکہ میں نے وقت بھی مقرر کر دیا تھا، ساتھ ہی مجھے کچھ کہنے کا موقع نہ دیکر کہنے لگیں کہ میں نے آپ کی مصوری کی بہت کچھ تعریف سنی ہے ۔ میں نے کسی قدر ترشی سے کہا..... یہ سب لوگوں کا حسن ظن ہے ..... باوجود اس کے مجھے یقین ہے کہ آپ کی جگہ عام سطح سے بلند ہے، اور میں نے تہیہ کر لیا ہے کہ اپنی ایک تصویر آپ سے کھنچواؤں گی..... ساتھ ہی تحکمانہ کہا.... میرے خیال میں کل سے کام شروع کر دینا چاہیئے۔ کہیے مجھکو روز کتنا وقت دینا پڑے گا اور کتنے دن میں نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا کہ آدھ گھنٹہ.... تین دن ۔ لیلیٰ نے مسکرا کر خاص ادا سے کہا کہ اچھا مجھے معاوضے میں کس قدر رقم پیش کرنی پڑیگی ۔ "جس قدر آپ چاہیں".... لیلیٰ اٹھ کھڑی ہوئیں اور ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا کہ بات طے ہو گئی، میں نے جواب میں ہاتھ ملا یا ۔ ایسا معلوم ہوا کہ میرا برف کے مانند سرد ہاتھ گویا آگ میں ڈال دیا گیا ہے.......
تین سکنڈ کے بعد لیلیٰ کمرہ سے نکل گئیں اور میں مفلوج کی طرح کرسی پر گر پڑا۔

مجھے یقین تو نہ آتا تھا مگر واقعات کہتے تھے کہ تصویر تیار ہو گئی صرف گہری نظر ڈال کر باریک نقائص دور کر دینے باقی تھے

جس طرح پاگل یا نیند کی حالت میں چلنے پھرنے والے مریض ہوش میں آنے کے بعد اپنے اعمال کے نتائج دیکھکر مبہوت رہ جاتے ہیں بالکل یہی حالت میری حیرت اور استعجاب کی تھی۔ ہر چند غور کرتا تھا مگر سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ تین دن کس طرح گزرے، تصویر کیونکر تیار ہوئی۔ لیلی سے کیسی ملاقاتیں ہوئیں — مگر جس طرح میخوار کے دماغ میں واقعات سکر کا ایک دھندلا پن رہ جاتا ہے اسی طرح میرے ذہن میں بھی ایک کمزور اور ضعیف سا خیال رہ گیا تھا۔ میں نے تصویر دیکھی اس سے اور بھی تعجب بڑھا۔ تصویر ہر قسم کے نقائص سے پاک بہترین تیار ہوئی تھی۔ اصل اور نقل میں "جاندار اور بے جان" ہی کا فرق تھا۔ تصویر میں لیلی کھڑی ہوئی تھیں بایاں ہاتھ خوشنما اسٹول پر رکھا ہوا تھا۔ بدن پر سیاہ ریشمی ساڑی تھی جس پر سپید پھول کڑھے ہوئے تھے۔ گلے میں پیازی رنگ کی جاکٹ تھی۔ جاکٹ کے نیم آستین تھے۔ جن کے کنارے لیس لگی ہوئی تھی۔ پاؤں میں کارچوبی پمپ تھا۔ زیور کی قسم سے ہاتوں میں ایک ایک طلائی چوڑی تھی اور بائیں ہاتھ کی انگلی میں انگشتری تھی۔ تصویر میرے روبرو تھی اور میں بے باکانہ طور پر دیکھ رہا تھا۔ اگرچہ میں نے اصل کو دیکھکر ہی نقل اتاری تھی اور اس سے پہلے بھی کبھی کبھی لیلی کو وکٹوریہ گارڈن میں تفریح کرتے دیکھ چکا تھا مگر کچھ تو اجنبیت اور کچھ "رعب حسن" غور سے دیکھنا نہ ہوا تھا۔ اب جو موقع ملا تو تصویر کو سراپا، از جز تا کل پوری طرح بہت دیر تک دیکھتا رہا۔ آخر اس نتیجہ پر پہونچا کہ "بیشک عورت قدرت کا ایک گہرا راز ہے جو حسن و شباب کے پردوں میں پوشیدہ ہے"۔ دیر تک سوچنے پر یاد آیا کہ اختتام کی اصلاح کے لئے میں نے ایک ہفتے کی مدت حاصل کر لی ہے۔ اس دن سے ایک ہفتے تک میرا کام دن میں تصویر درست کرنا اور شب میں ایک اور کاپی تیار کرنا رہا۔ دوسری کاپی تیار کرنے کی وجہ میں نہیں بتلا سکتا تھا۔ میری اپنی زندگی میں یہ پہلا کام تھا جو میں بلا ارادہ اور بلا مقصد کے کر رہا تھا۔ کام ختم ہونے کے بعد مجھے ایک شخص کے ذریعہ سے (جو غالباً لیلی کا نوکر تھا) ایک چھٹی ملی جس میں تحریر تھا۔

جناب عالی! حامل ہذا میرا معتمد ملازم ہے۔ تصویر جو غالباً تیار ہو گئی ہوگی اس کے ہاتھ روانہ کر دیجئے۔ مجھے نہیں معلوم کہ آپ کا محنتانہ کیا مقرر ہے۔ پھر بھی میں نے فی الحال ایکہزار کے نوٹ امپیریل بنک ب کے کھاتے میں جمع کرا دے ہیں۔ پورا محنتانہ معلوم ہونے پر بقیہ رقم بھی جمع کرادی جائیگی۔ میں مشکور ہوں کہ آپ نے بڑی محنت اور دلچسپی سے تصویر تیار کی۔ لیلی

عورت کا ہر کام عجیب و غریب ہے اور حکمت و مصلحت سے خالی نہیں، وہ ہنستی ہے تو سمجھئے کہ پروپگنڈا کرتی ہے، وہ روتی ہے تو سمجھئے کہ اس کے ہر آنسو میں جال بچھا ہوا ہے۔ اس کی ہمدردی "بہت کم" ہمدردی رہتی ہے۔ اس کا غصہ بھی دراصل غصہ نہیں ہوتا۔ بہرحال تصنع، بناوٹ، دھوکہ۔ کاہریت اسکے روزانہ مشاغل ہیں — میں نے تصویر دیدی اور جواب لکھا کہ:

تصویر حاضر ہے۔ محنتانہ محنت کے پہلے طے پاتا ہے۔ جب یہاں ایسا نہیں ہوا ہے تو اس کے صریح معنے یہ ہیں کہ میں دس ہزار روپے بھی اجرت مقرر کر سکتا ہوں اور ایک پائی بھی نہیں۔ لیکن میں ان دو میں سے ایک طریقہ بھی اختیار نہ کرونگا کیونکہ مجھے آپ ایسی

مشہور ہستی کی تصویر ہی کھینچنے سے تصویر کشی کا صلہ مل گیا۔ اگر آپ اس پر بھی مزید مہربانی کرنا چاہتی ہیں
تو کوئی ایسی چیز عنایت فرمائیے جو آپ کی تصویر کھچوانے کی یادگار رہے۔

چوتھے روز وہی آدمی جو تصویر لے گیا تھا جواب لایا لکھا تھا:۔

آپ کی خواہش عجیب و غریب ہے خیر چونکہ مجھ سے محنتانہ طے نہ کر لینے کی غلطی سرزد ہوگئی تھی اسلئے
بہرحال آپ کی خواہش پوری کرنی پڑیگی ۔۔۔۔ پرسوں میری اکیسویں سالگرہ کی تقریب ہے۔
اُمید کہ شام میں شریک "ایٹ ہوم" ہو کر ممنونیت کا موقع دیا جائیگا ...... ساتھ ملازم نے ایک خوبصورت ڈبیا پیش کی۔
کھولکر دیکھنے پر میں متحیر اور خوش ہوا کہ ایک سہ نگی بہترین انگشتری تھی۔ میں ڈیڑھ دو منٹ تک محویت اور استعجاب سے
دیکھتا رہا۔ آخر ملازم کی موجودگی کے خیال سے استعجاب پر غالب آنے کی کوشش کی ...... تعجب میں اور بھی اضافہ ہوا
جب ڈبیہ میں بھی ایک چھٹی رکھی ہوئی ملی ۔۔۔۔

مس لیلیٰ صاحبہ! مرسلہ انگشتری آنکی گئی۔ میرے خیال میں درمیاں کا نگینہ ایکہزار کا اور بازوؤں
کے پانچ پانچ سو کے ہیں ۔۔۔ اگر یہ بکاؤ ہے تو میں خوشی سے اس کا معاوضہ پیش کرنے کے لئے
تیار ہوں "

سورج بلی جوہری

کیسی ذہین اور بے لاگ عورت ہے مجھ پر یہ ثابت کرنا چاہتی ہے کہ یہ نگینے جھوٹے اور کم دام کے نہیں اور اگرچہ میں نے
انگشتری ہی روانہ کر کے احسان کیا ہے مگر یہ کچھ ایسی کم قیمت بھی نہیں کہ جو محنت کا معاوضہ ثابت نہ ہو ...... یہ تھے میرے
خیالات جو اس واقعے کے بعد ذہن میں آتے رہے۔ دوسرا روز بڑی بےچینی سے گزرا۔ ایٹ ہوم میں شریک نہ ہونا چاہتا تھا مگر
جس طرح آدم نے عورت کے کہنے سے خدا کی نافرمانی کی تھی" اسیطرح ضمیر کے روکنے پر بھی مجھے ضیافت میں شریک ہونا پڑا۔ جب میں
لیلیٰ کے عالیشان مکان میں داخل ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک کثیر جماعت بڑے ہال میں لگی ہوئی تصویر کو دیکھ رہی ہے۔ لیلیٰ وہی
ساڑی زیب بدن کئے ہوئے تھیں جس سے تصویر اتاری گئی تھی۔ انھوں نے سب حاضرین سے میرا تعارف کرایا۔ ساتھ ہی سب
کی ملی ہوئی تعریف کی آوازیں میرے کانوں میں پہونچیں ۔۔ مجھے یقین ہوگیا اور کامل یقین کہ در اصل میں مصوری کا دیوتا
ہوں، کیونکہ جب میں لیلیٰ اور ان کی تصویر کو دیکھتا تھا تو یہی معلوم ہوتا تھا کہ ایک مہمانوں کے آگے ان کے استقبال کے لئے
کھڑی ہیں اور دوسری چل پھر رہی ہیں۔ لیلیٰ یوں تو سب مہمانوں کے ساتھ بہترین اخلاق سے پیش آرہی تھیں مگر میری طرف
اُن کا التفات بہت خوفناک تھا۔

ضیافت بڑی شاندار رہی۔ لیلیٰ نے کچھ دیر پیانو بجا کر مہمانوں کو مسرور بھی کیا۔ اس کے بعد ایک ایک مہمان رخصت ہونے لگا
۔ میں عمداً ٹھہر گیا کہ ذرا ہجوم کم ہو جائے تو رخصتی ملاقات ہو۔ کیونکہ دل کے منصوبے اور راز زباں پر آنا چاہتے تھے۔ میں جب رخصت

ہوتے ہوئے ملا تو لیلیٰ نے بڑی گرم جوشی ظاہر کی اور تکلیف دینے پر رسماً معذرت کرنے لگیں...... میں نے کامل سنجیدگی اختیار کرکے کہا "آپ کے عطیہ کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور عرض ہے کہ اگر...... لیلیٰ نے کہا کہئے کہئے - میں کہنے لگا...... اگر کبھی کبھی مزاج پرسی کے لئے حاضر ہونے کی اجازت دیجائے تو خوش قسمتی خیال کرونگا - لیلیٰ کے ہونٹوں پر عجیب قسم کی مسکراہٹ آگئی جیسے شکاری کے لبوں پر شکار پر قابو پاکر جوش فتح سے آتی ہے - اجازت ملگئی...... رخصتی مصافحہ ہوا...... میرا ہاتھ غیر ارادی طور پر دیر تک لیلیٰ کے نرم و نازک ہاتھ کو پکڑے رہا اور چھوڑتے وقت میں نے اضطراری کیفیت میں..... گرفت سخت کرکے ڈھیلی کی - اس کے بعد ہم علٰحدہ ہوگئے -

میں اس قصے کو حتی الامکان مختصر کرنے کی کوشش کرونگا - ان واقعات کے بعد وہی ہوا جو لوہے کے قریب مقناطیس کے پہونچنے سے ہوتا ہے - ملاقاتیں بڑھیں - بے تکلفی ہوگئی - ہفتے میں دو دن ہم ایک ساتھ تفریح کو جانے لگے - اس منزل پر پہونچکر میں نے..... تصویر کی دوسری کاپی جو بغیر اطلاع کے تیار کرلی تھی دکھائی - اور ساتھ ہی اصل کو بار بار دیکھکر نقل کی مدد سے دل کے پردوں پر جو غیر فانی تصویر کھینچی تھی پیش کردی - ان چیزوں کو دیکھکر لیلیٰ پر کوئی خاص کیفیت طاری نہیں ہوئی اور نہ پھر گفتگو کا موقع آیا - دنیا کے قاعدہ کے موافق میں نے خاموشی کو "رضامندی کے نسوانی طریقے" پر محمول کیا - مگر آہ مجھے کیا معلوم تھا کہ دوستی کا انجام دشمنی اور اتفاق کا اختتام نفاق پر ہوگا - جس وقت بھی درد دل کے وضاحت سے بیان کرنے کا موقع آیا - لیلیٰ نے ادھر ادھر کی باتیں شروع کردیں - جب کبھی مرد کی بیتابیاں بڑھتی ہیں - عورت ہمیشہ روکتی ہے یا روکنے کی کوشش کرتی ہے - عام لوگ سمجھتے ہیں کہ مرد کو گناہ سے باز رکھتی ہے یا پاکباز بنانا چاہتی ہے مگر جاننے والے جانتے ہیں کہ اس کے "روکنے" کا مقصد "بڑھانا" ہوتا ہے "جذبات کو ناصحانہ کلمات سے فرو کرنا" "بھڑکانا" ہوتا ہے - وہ محبت کی شاخوں کو کاٹتی ہے کہ عشق کا درخت پوری طاقت سے بڑھے - اور اس سے وہ خود بھی ناواقف نہیں وہ خوب جانتی ہے اور عمداً کرتی ہے - دن گزرتے گئے اور میں من کے مندر میں سمائے ہوئے بت کو پورے شوق اور کامل دلچسپی سے پوجنے لگا - اسیطرح ایک سال کی طویل مدت ایک سکر کی حالت میں گزر گئی -

ایک دفعہ روز مقررہ پر جبکہ میں لیلیٰ کے گھر جانے ہی والا تھا ٹیلیفون سے لیلیٰ نے کہا کہ "معاف فرمایئے - آج میں ایک خانگی مصروفیت کی وجہ سے آپ کے ساتھ تفریح کو نہیں جاسکتی...... قبل اس کے کہ میں کچھ کہتا یا مزاج پرسی کرتا ریسور ہاتھ سے رکھدیکر تار منقطع کردیا گیا تھا - اس کے بعد دوسرے روز مقررہ پر جب میں لیلیٰ کے گھر.... پہونچا تو خلاف معمول کسی قدر باتکلف پایا - حیرت ہوئی - طبیعت کا حال دریافت کیا - جواب بھی "غیر معمولی تھا" - میں نے کہا آج آپ کی طبیعت افسردہ معلوم ہوتی ہے - تفریح کو چلنا چاہئے.... چلئے موٹر حاضر ہے - لیلیٰ نے کسی قدر ترشروئی سے کہا... میں ایک صاحب کے انتظار میں ہوں - آج تفریح کو نہیں جاونگی مجبوری ہے - میرے قلب پر چوٹ سی لگی - زمانے کے انقلاب کا پوری طرح یقین ہوگیا - کل تک جو ہستی مجھ سے ہنس ہنس کر بات چیت کرتی تھی، آج غصے سے بھی پوری بات نہیں کرتی جو شخص اپنے آپ کو

کل تک ہفت اقلیم کے بادشاہ سے زیادہ خوش قسمت خیال کرتا تھا آج خود کو دنیا کا بد ترین انسان سمجھ رہا ہے۔ موٹر میں سوار ہوا تو بے اختیار آنسو نکل پڑے۔ دفعتاً اپنی پوزیشن اور شاہ راہ عام کا خیال آگیا، جلدی آنکھیں صاف کرلیں۔ شوفر نے دریافت کیا "وکٹوریہ گارڈن" چلوں یا "طلسمی پل" میں نے سخت لہجہ میں کہا گھر چلو۔ موٹر چلنے لگا۔ بہ مشکل دو فرلانگ طے کئے تھے کہ موٹر کی رفتار سست ہونے لگی۔ شوفر نے ندامت کے لہجہ میں کہا کہ۔ آج پٹرول ڈالنا بھول گیا، اب ضرورت ہے۔ میں نے کہا خرید لو۔ قریب کے پٹرول مشن سے پٹرول حاصل کرنے کے لئے شوفر نے موٹر روک لیا، چونکہ ایک اور موٹر پٹرول لے رہا تھا اس لئے ۱۰ منٹ انتظار کرنا پڑا۔ میری پشت کی طرف سے ہارن کی آواز آئی دلدار کے گھر کے کتے بھی پہچانے ہوئے ہوتے ہیں۔ پلٹ کر جو دیکھا تو موٹر قریب سے تیزی کے ساتھ نکل گئی۔ تاہم میں نے دیکھ لیا کہ لیلیٰ شہر کی مشہور اور کامیاب بیرسٹر احمد کے پہلو میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ دل کی جو حالت ہوئی اس کا ضبط تحریر میں آنا مشکل ہے۔ دل ڈوبنے لگا، قریب تھا کہ حرکت بند ہو جائے اپنی بربادی پر رونا آرہا تھا...... اور برباد کرنے والے پر غصہ۔ دل چاہتا تھا کہ موٹر کا تعاقب کروں۔ مگر پھر حسن ظن غالب آتا تھا۔ ممکن ہے کہ کسی خاص قانونی مہم کے سر کرنے کے لئے دونوں کا ملنا ہوا ہو۔ گھر پہونچا۔ کہہ سکتا ہوں کہ شب میں سوتا رہا نہ جاگتا بلکہ ان دونوں حالتوں کی درمیانی کیفیت یعنے ایک غشی طاری رہی۔

صبح بستر سے اُٹھا تو دوران سر تھا اور طبیعت انتہائی افسردہ تھی حال میں ضروریات سے فارغ ہو کر اپنے پیشے کا کام کرنے بیٹھ گیا۔ گھنٹہ بھر کام کرنے کے بعد خیالات کی کثرت سے کام بند کر دینا پڑا۔ آدھ گھنٹے تک اپنی حالت پر غور کرتا رہا میری نظروں میں پچھلے سارے پر کیف واقعات یکے بعد دیگرے پھر گئے حیرت تھی کہ کیا سے کیا ہو گیا اور پھر نہیں معلوم کیا سے کیا ہو جائیگا۔ خواہش ہوئی کہ لیلیٰ کی تصویر کو دیکھنا چاہیے، اُٹھا۔ "پرائیوٹ روم" میں آکر تصویر سے پردہ ہٹا دیا...... شوق اور حسرت بھری نظروں سے دیر تک دیکھتا رہا تصویر میں تو کسی قسم کا تغیر نہ ہوا تھا۔ وہی سپید پھول والی سیاہ ساڑی، وہی غرور حسن کی وجہ سے سیدھا کھڑا ہونا۔ وہی شکل کی انتہائی معصومیت اور بھولا پن جس سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ ہستی دنیا کے کسی کام کے لئے پیدا نہیں کیگئی ہے۔ عالم دہر میں بھیجی گئی ہے تو صرف اس وجہ سے کہ دنیا کو عشق و محبت کی تعلیم اور پرستش حسن کی دعوت دے یکایک خیال ایکروز قبل کے واقعے کی طرف گیا.... قلب کی حرکت سست ہو گئی۔ دوران خون بند ہو گیا۔ نظروں کے آگے چنگاریاں اڑتی ہوئی نظر آئیں اور چکرا کر گر پڑا۔ جب ہوش آیا تو بڑے ہال میں پلنگ پر خود کو لیٹا ہوا پایا سر سے پٹی بندھی ہوئی تھی۔ جسم دہک رہا تھا، کوشش کی کہ اٹھ بیٹھوں مگر فوراً میرا مددگار آگے بڑھا..... ڈاکٹر نے کہا کہ آپ کو کامل طور پر آرام لینے کی ضرورت ہے کیونکہ خون زیادہ بہہ گیا ہے اور بخار پانچ ہے۔ اب کہیں مجھے سر سے بندھی ہوئی پٹی اور پیشانی میں سخت تکلیف ہونے کا سبب معلوم ہوا۔ آنکھیں بند کرلیں۔ مددگار نے تھوڑی دیر بعد برانڈی کے کچھ قطرے لیمینڈ میں شریک کر کے دے حلق اور سینہ بار بار سوکھ رہا تھا اس لئے لیمینڈ ملتے ہی پی گیا ذرا طبیعت ٹھکانے لگی ـــــ قاعدہ ہے کہ انسان مصیبت اور تکلیف میں دوست اور خیر خواہ کو ہی یاد کرتا ہے۔ اسی روز شام میں آہستہ اُٹھا اور ٹیلیفون کے قریب گیا کہ لیلیٰ کو اپنی بیماری

کی اطلاع دوں ـــ میری کیفیت سنکر لیلیٰ نے خشک لہجہ میں کہا۔ بہت افسوس ہے، خدا آپ کو جلد صحت دے ..... میں ایک ہفتہ کے لئے باہر جا رہی ہوں اور بہت جلدی میں ہوں، ورنہ مزاج پرسی کے لئے آتی۔ میں مبہوت رہگیا کچھ نہ کہہ سکا، رسیور دو تین منٹ ہاتھ کا ہاتھ میں رہا ایک ہفتہ گزر گیا مگر سخت تکلیف سے۔ ایک روز میں صبح اخبار دیکھ رہا تھا جب "لوکل کالم" پر نظر پڑی تو اخبار ہاتھ سے گر گیا اور میں کرسی سے ـــ لکھا تھا:-

"سنا گیا ہے کہ شہر کے کامیاب وکیل مسٹر احمد کی نسبت مس لیلیٰ صاحبہ سے قرار پائی ہے۔ دو ہفتے کے اندر اندر مراسم عقد بھی عمل میں آجائیں گے۔ ہم اس ہونے والے مناسب اور کامیاب جوڑے کو مبارکباد دیتے ہیں"۔

قریب تھا کہ میرا دل پھٹ جائے ـــ مگر افسوس میری قسمت میں تو کوئی اور ہی قسم کی موت لکھی ہوئی تھی ـــ دل کو سنبھالا دل کی بے چینیوں کو اطمینان دلانے کی کوشش کی ـــ اس کے بعد کامل دو دن میں میں نے اپنی مصوری کی پوری قوت اور اپنے دل کا سارا ذخیرہ خرچ کرکے ایک تصویر تیار کی ـــ نہ صرف یہ میری بہترین کھینچی ہوئی تصویر تھی بلکہ یہ میری مصوری کا آخری نمونہ بھی تھا۔ میں اس کے بعد کوئی تیار نہ کر سکا ـــ تصویر ذیل کے منظر کو پیش کرتی تھی:-

آسمان ابر آلود ہے۔ احمد بیرسٹر اور لیلیٰ ایک سرسبز باغ میں حوض کے کنارہ خوش خوش بیٹھے ہوئے تھے۔ فوارہ چل رہا تھا۔ آگے شراب سے بھری ہوئی صراحی رکھی ہوئی تھی۔ لیلےٰ جام بھر کے احمد کو دے رہی تھی ـــ میں بسمل ان سے پانچ گز کے فاصلہ پر تڑپ رہا تھا گلے اور سینے سے خون کے فوارے جاری تھے۔ ایک بڑا سا خون کا دھبہ لیلیٰ کے دامن پر بھی دکھایا گیا تھا۔

یہ تصویر تیار کی اور ملازم کے ہاتھ غلاف میں رکھکر لیلیٰ کے پاس بھیجدی۔ آہ میری خاموشی ہزار گویائی کے برابر تھی، تصویر وہ سب کچھ ظاہر کر رہی تھی جو میرے دل میں تھا اور شاید بالمشافہ زباں پر نہ آسکتا۔ مگر اس ظالم، بیوفا، بیدرد کو کیا کہئے..... یہ کہکر واپس کر دیا کہ "میں نے تو اس قسم کی تصویر کی کوئی فرمائش نہ کی تھی" ـــــــ

آہ! اس واقعہ کے ایک ہفتہ کے بعد وہ واقعہ ہوگا جس کا تصویر میں لیلیٰ کے دامن پر خون کا دھبہ لگا کر اشارہ کیا گیا تھا اور جس کے ہو چکنے کے بعد ہی میرا یہ خط دنیا کے آگے پیش ہوگا۔

بد نصیب
ہمایوں مصوّر

ناظرین کل کے حیرت انگیز واقعات پڑھکر یقیناً انگشت بدنداں رہجائیں گے۔ مس لیلیٰ صاحبہ (جن کے متعلق ایک ہفتہ سے قبل کی اشاعت میں لکھا گیا تھا کہ آپ کے کامیاب بیرسٹر مسٹر احمد کے ساتھ نسبت ہوگئی ہے اور عنقریب مراسم

شادی ادا ہو جائیں گے) کل شام حسب معمول "طلسمی پل" سے موٹر میں گذر رہی تھیں کہ ایک شخص کنارہ سے دوڑتا ہوا عین موٹر کی زد میں آگیا۔ قبل اس کے کہ ڈرائیور بریک کرے ٹکر ہو کر موٹر اس اجنبی کے سینے پر سے گذر گئی تھی —— زخمی کو فوراً سیول ہاسپٹل لایا گیا جہاں وہ بمشکل گھنٹہ بھر زندہ رہا۔ سنا جاتا ہے کہ اس جوانمرگ کو چند آدمیوں نے مس لیلیٰ کی موٹر آنے کے ایک گھنٹہ قبل پل کے کنارے کسی کے انتظار میں ٹہلتا دیکھا تھا۔ جس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ یہ حسرت نصیب کوئی فاتر العقل نہ تھا ——

دنیا سمجھتی تھی کہ سچے عاشق اب پیدا نہیں ہوتے مگر ناظرین کو یہ پڑھکر جس قدر بھی تعجب ہو کم ہے کہ مذکورہ موٹر سے ٹکراکر جان دینے والا شخص ہمارے شہر کا مشہور اور ذی عزت مصور "ہمایوں" تھا۔

بدنصیب ہمایوں نے یہ حرکت کیوں کی اس کا جواب خود انکا خط دیگا جو ان کے مرنے کے بعد کوٹ کی جیب سے نکلا اور جس کو صفحہ ۶۳ پر شائع کر دیا گیا ہے۔ ناظرین اس کو فسانہ نہ سمجھیں ——

فخر نظامی حیدرآبادی

بادۂ ناب مجموعہ رباعیات فارسی میر ولی اللہ صاحب بی اے عہ

مطالبہ فطرت ۔ مجلد اتحاد فلسفہ اسلام پر ایک بےمثل تصنیف عہ

عروس ادب ۔ حضرت ہوش بلگرامی کے مضامین کا مجموعہ عا ر

سالومی ۔ اسکر وائلڈ کا نہایت مشہور ڈرامہ مترجمہ مجنوں گورکھپوری ۱۲ ر

تذکرہ بلھے شاہ ۔ پنجاب کے نہایت مشہور بزرگ کے تاریخی حالات مستند ذرائع سے قیمت صرف ۸ ر

بندگی ۔ امام ابن تیمیہ کی مشہور کتاب "العبودیت" کا بےمثل ترجمہ حقایق دینی و تصوف کی بےنظیر کتاب قیمت ۱۰ ر

کاس الکرام عمر خیام کے مفصل حالات زندگی اور مکمل شرح اس موضوع پر پہلی کتاب قیمت صرف ے ر

خلق عظیم ۔ یعنی اخلاقی مضامین پر احادیث نبوی کا ایک مکمل مجموعہ عہ ر

فتنۂ خلق القرآن ۔ امام عبد العزیز بن یحیٰی کی کتاب "الحیدہ" کا ترجمہ مسئلہ قرآن کے متعلق ایک بےنظیر محاکمہ قیمت صرف ۱۰ ر

لسان الغیب ۔ حافظ شیرازی کی سوانح عمری اور ان کے دیوان کی بہترین شرح جلد اول تین روپے جلد دوم دو روپے

کلیات نظم حالی ۔ شمس العلما حالی کے تمام منظوم کلام قیمت ۱۲ ر

نقش ارژنگ ۔ جلال الدین صاحب کی غزلوں کا مجموعہ عہ ر

تاریخ دولتین ۔ جرجی زیدان کے تاریخ تمدن اسلامی کا ترجمہ قیمت صرف عہ ر

صحابیات ۔ عہد سعادت کی ۵۰ خواتین کے مستند حالات عہ ر

شاعر کا انجام ۔ حضرت نیاز فتحپوری کا بےمثل افسانہ ۱۲ ر

جذبات بھاشا ہندی شاعری کے بےمثل نمونے ۱۲ ر

شہاب کی سرگزشت

انتخاب اودھ پنچ ۔ ۱۸۷۷ء کے اودھ پنچ کی جلدوں کا لاجواب انتخاب قیمت عہ ر

منیجر نگار بک ایجنسی لکھنؤ

گزشتہ ماہ کا مضمون "فلسفہ مذہب"

اور

اس کے متعلق میری رائے

گزشتہ ماہ کے نگار میں "فلسفۂ مذہب" کا جو حصہ شائع ہوا ہے، اس سے مجھے اختلاف تھا، چنانچہ ملاحظات کے سلسلہ میں مختصراً میں نے اس کا ذکر بھی کر دیا تھا اور خیال تھا کہ جب یہ سلسلہ ختم ہو جائے گا تو ایک محاکمہ اس پر کرونگا، لیکن بعض احباب کا تقاضا شدید ہوا کہ میں جلد سے جلد اپنی رائے شائع کر دوں مگر اتفاق سے یہ تقاضا اس زمانہ میں ہو رہا ہے جب میں علیل و صاحب فراش ہوں۔ اس لئے تعمیل ارشاد تو کرتا ہوں لیکن بسط و تفصیل کو کسی دوسرے وقت پر ملتوی کرتے ہوئے۔

جن حضرات نے شروع سے اس مضمون کا بہ غائر نگاہ مطالعہ کیا ہے، ان سے مخفی نہیں کہ سید مقبول احمد صاحب حد درجہ حرّیت فکر سے کام لیکر اپنے خیالات مذہب کے متعلق پیش کر رہے ہیں اور چونکہ اعتقادات بالکل انفرادی چیز ہیں اس لئے ایک شخص کو اختیار حاصل ہے کہ وہ جس تاویل کو اپنے حال کے مطابق پائے قبول کرے لیکن اعتقادات سے ہٹکر، عبادات و معاملات میں یہ اصول کار آمد نہیں۔

یعنی اگر مذہب نام ہو صرف توحید اور رسالت رسول کے اعتراف و یقین کا تو ایک شخص کو اختیار حاصل ہے کہ وہ خدا کو ایک ماننے اور رسول کو برحق سمجھنے کے لئے اپنے خیال کے مطابق جو چاہے تاویلیں کرلے، لیکن اگر مذہب سے مقصود ہیئت اجتماعی کی تشکیل و تنظیم بھی ہے تو پھر عبادات و معاملات میں جو ہیئت اجتماعی کے شیرازہ بند ہیں تاویل آزادی ممکن نہیں ورنہ اصل مقصود فوت ہو جائے گا۔

میری رائے میں سید مقبول احمد صاحب نے اس نکتہ کو نظر انداز کر دیا اور مذہب کو انھوں نے تمدن کے اصول سے نہیں دیکھا حالانکہ وہ اس کے مدعی ہیں۔

یہ حقیقت کسی صاحب فہم سے مخفی نہیں ہے کہ ایک رسول کا وجود اگر حقیقی معنے میں دنیا و اہل دنیا کے لئے باعث خیر و فلاح ہوا ہے تو صرف اس بنا پر کہ اس نے انسانوں کے منتشر افراد کو ایک رشتہ سے وابستہ کر دیا، ان میں ایک غرض مشترک پیدا کر دی۔ ان کے دماغ کے رجحانات ان کی ذہنیات اور ان کے امیال و عواطف میں یک رنگی پیدا کر کے اُن کو مجبور کر دیا کہ وہ اپنے آپ کو ایک ہی مقصد کا طالب سمجھیں، ایک ہی مدعا کے حصول میں تگ و دو کریں اور ایک ہی منزل

کا ساز سمجھکر باہم ایک دوسرے کے مدد کریں جو نظام تمدن کی اصل روح ہے۔

اگر معاشرت و معیشت یا اصول زندگی کی یکرنگی کو علٰحدہ کردیا جائے تو ایک قوم کا وجود قومی بالکل معدوم ہوجاتا ہے اور پھر کوئی چیز ایسی باقی نہیں رہتی جو مختلف افراد کو ایک دوسرے سے وابستہ کرسکے، صرف مذہبی معتقدات کا خیال بظاہر صورت کوئی ایسا منظر پیش نہیں کرسکتا جس کا اثر دوسروں پر یا خود اپنی ہی جماعت کے افراد پر ایسا پڑے کہ تنظیم و تشکیل کا احساس ہوسکے۔ خود یورپ کو دیکھئے کہ معتقدات مذہبی کے لحاظ سے وہ منکر محض ہیں لیکن چونکہ اصول زندگی میں ان کے اتحاد تام ہے اس لئے ان کا ایک ایک فرد اپنے اندر پوری اجتماعی شان رکھتا ہے اور دوسروں پر اس کا خاص اثر ہوتا ہے۔

الغرض بانی اسلام نے جو خاص اصول عبادات کے اور مخصوص قواعد معاملات کے مقرر کردئے تھے ان سے بھی مقصود یہی تھا کہ مسلمانوں میں یکرنگی و یک جہتی پیدا ہوجائے اور اس طرح ان میں قومی تعاون کی روح پیدا ہوجائے، اس لئے اگر آج ہم ان کو توڑدینگے تو اس کے یہ معنے ہوں گے کہ ہم قومیت کو صدمہ پہونچانے والے ہیں اور اپنی جماعت میں تشتت و انتشار پیدا کرنے والے کہلائیں گے۔ اگر یہ کہا جائے کہ اب سے تیرہ سو سال قبل کے مقرر کردہ اصول زمانۂ حال کے لئے موزوں نہیں ہوسکتے اور ان میں تغیر و تبدل ضروری ہے، تو اس کا نفاذ بعض بعض معاملات میں ممکن ہوسکتا ہے لیکن عبادات میں ممکن نہیں ہے کیونکہ اس سے رسول کی شانِ رسالت کو صدمہ پہونچتا ہے اور یہ ماننا ضروری ہوجاتا ہے کہ خود رسول نے قرآن کو اچھی طرح نہ سمجھا تھا۔

اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ قرآن سے بقول سید مقبول احمد صاحب نماز صرف تین وقت کی بلا تعیین ارکان و تعدیل ثابت ہوتی ہے یا یہ کہ وضو میں بھی کوئی خاص ترتیب مذکور نہیں ہے تو پھر یہ امر غور طلب ہوگا کہ رسول اللہ نے اپنی زندگی میں خود کیا کیا اور لوگوں کو کیا ہدایت کی اور قرآن کے اس مجمل حکم کی شرح خود انھوں نے کس طرح بیان کی اور اپنے عمل سے دکھائی۔

یہ تو غالباً سید مقبول احمد صاحب بھی مانتے ہوں گے کہ کلام مجید کا بہتر سمجھنے والا رسول اللہ سے زیادہ کوئی دوسرا نہیں ہوسکتا اس لئے ظاہر ہے کہ اس باب میں جو کچھ رسول اللہ کا ارشاد و عمل ہے وہ صحیح ہوگا اور وہی مقصود خداوندی ہوگا۔ پھر اگر رسول اللہ نے وضو میں کسی خاص ترتیب کو ملحوظ رکھا یا نماز میں تعدیل ارکان و تعیین اوقات پنجگانہ کی تاکید فرمائی تو کوئی وجہ نہیں کہ آج ہم اس کو اٹھادیں اور غیر ضروری سمجھیں، علی الخصوص اس وقت جبکہ ان پابندیوں میں کوئی حرج نہیں ہے صرف تین اور پانچ کے جھگڑے میں اتنے دیرینہ اصول کو جو نسلاً بعد نسلٍ سیکڑوں برس سے منتقل ہوتا چلا آیا ہے ترک کردینا کس قدر لایعنی بات ہے علاوہ اس کے یوں بھی دیکھئے کہ ہر کام میں ترتیب و تعدیل ہی ایک خاص چیز ہے جو اجتماعی شان پیدا کرتی ہے، اگر ہم اس کو ترک کردیں گے تو کوئی نتیجہ مرتب نہ ہوگا اور ہماری مذہبی اعمال میں اس قدر اختلاف ہوجائیگا کہ دوسرا دیکھ کر فوراً حکم لگادیگا کہ یہ سب ایک دوسرے سے جدا ہیں اور ایک مذہب یا مسلک کے پابند نہیں ہیں۔

فرض کیجئے مسجد میں دس آدمی بیٹھے ہوئے وضو کررہے ہیں یا نماز پڑھ رہے ہیں تو لطف و کیفیت اس میں ہے کہ سب ایک ہی طرح

یکسانیت ویکرنگی کے ساتھ ارکان کو ادا کر رہے ہیں، یا اس میں کہ کسی نے پہلے منہ دہویا، تو کسی نے پاؤں کے مسح سے ابتدا کی کسی نے کلی سے آغاز کیا تو کسی نے کہنیوں کو پہلے دہونا پسند کیا۔ اس طرح نماز کی یہ حالت قابل التفات ہے کہ سب ایک ساتھ یکرنگی کے رکوع وسجود کر رہے ہیں یا یہ کہ کوئی کھڑا ہوا صرف ہات اٹھائے ہوئے ہے۔ دوسرا بیٹھا ہوا کچھ پڑھ رہا ہے، تیسرا سجدہ میں گرا ہوا۔ کسی کا منہ قبلہ کی طرف ہے کوئی قطب کی طرف رخ کئے ہوئے ہے اور کوئی جنوب کو دیکھ رہا ہے۔

اگر ترتیب وتعدیل کو حذف کر دیں تو عبادات میں کوئی صورت ہم آہنگی کے رہتی ہی نہیں اور اسلام کا یہ فخر کہ اس نے عبادات کے سلسلہ میں وہ درس دیا ہے جو دوسرے مذاہب کے معاملات میں بھی نہیں پایا جاتا اُس سے چھن جائیگا۔

اسی طرح زکوٰۃ کے متعلق سید مقبول احمد صاحب کا یہ کہنا کہ جس قدر ہو سکے ادا کیا جائے بالکل خلاف اصول ہے۔ زکوٰۃ کا مسئلہ قومی تنظیم کا نہایت اہم مسئلہ ہے اور اس کے لئے جب تک کسی نصاب یا رقم کے تعیین نہ ہو کوئی ضابطہ مقرر نہیں ہو سکتا ہے روزہ، قربانی، عیدین، اور ان سے اتر کر ختنہ، عقیقہ، وغیرہ کے مسائل ہیں کہ ان سب سے مقصود وہی تنظیم حیات ہے اور جبتک ان میں ضابطہ ویکسانیت نہ پیدا کی جائے کوئی نتیجہ نہیں نکل سکتا۔ اس لئے میری رائے میں سید مقبول احمد صاحب کا ان مسایل سے بحث کرنا اور ان میں اتنی آزادی اختیار کرنا کہ جس کا جو جی چاہے کرے حد درجہ مضر ہے

بعض استدلالات تو انھوں نے مضحک [illegible] بخادے ہیں مثلاً یہ کہ پاؤں دہونے سے بعض اوقات اور بعض قوم کے لوگوں کو زکام ہو جاتا ہے اس لئے وضو میں پاؤں دہونا ضروری نہیں، مسح کر لینا چاہئے، اول تو اصول طب کے لحاظ سے پاؤں کا دہونا خود زکام کا دور کرنے والا ہے لیکن اگر کوئی شخص ایسا ہو تو بیشک مذہب بھی اُسے مجبور نہیں کرتا۔ لیکن اس کے یہ معنے تو نہیں ہیں کہ پاؤں دہونے کو ارکان وضو ہی سے خارج کر دیا جائے۔ پاؤں کا دہونا اصولاً جس طرح ان لوگوں کے لئے ضروری ہے جو ننگے پاؤں پھرتے ہیں اور جن کے پاؤں میلے ہوتے ہیں۔ اسی طرح بلکہ ان سے زیادہ ان لوگوں کے لئے ہے جو ہر وقت موزہ اور بوٹ سے جکڑے رہتے ہیں، کیونکہ پاؤں میں گندگی صرف باہر ہی کی خاک سے پیدا نہیں ہوتی بلکہ خود اس کے اندر سے پیدا ہوتی ہے اور وہ لوگ جو ہر وقت جوتا اور موزہ پہنے رہتے ہیں اُن کے پاؤں بہت زیادہ گندے رہتے ہیں اور ان کو پاؤں کا دہونا بہت زیادہ ضروری اور طبّاً لازم ہے۔

مضرت کے اندیشہ کی صورت میں شرع نے خود اس کو غیر ضروری قرار دیا ہے یہاں تک کہ صرف موزہ اور جوتہ کے اوپر مسح کر لینا کافی خیال کیا جاتا ہے۔

نماز کے تعیین اوقات کے سلسلہ میں کسی جگہ سید مقبول احمد صاحب نے شاید یہ بھی لکھا ہے کہ عصر ومغرب کی نماز ایک یوروبین سے ادا ہونی مشکل ہے کیونکہ یہ اس کی تفریح اور ٹینس وغیرہ کا وقت ہے۔ اس کے جواب میں سوائے اسکے کہ سپر ڈالدوں اور کیا عرض کر سکتا ہوں۔ عبادات پر تفریح کے مشاغل کو ترجیح دینا میں نہیں سمجھ سکتا کہ کیا ذہنیت ہے اسی طرح دوپہر کی نماز کے لئے کاروبار کی مصروفیت کا عذر کہ یہ بھی کسی طرح میری سمجھ میں نہیں آتا۔ اہل یوروپ

اس میں شک نہیں کہ سخت کاروباری آدمی ہیں اور بے انتہا مصروف ہیں، اسی کے ساتھ کوئی سچا مذہب کبھی ایسی تعلیم نہیں دے سکتا
جو کاروبار میں حرج ڈالنے والی ہو۔ لیکن کیا اس سے انکار ہو سکتا ہے کہ وہی یورپ والے جن کی رعایت میں سید مقبول احمد صاحب
نماز کے اوقات و ارکان کو بدل دینا چاہتے ہیں، اپنی زندگی کے بدترین مشاغل کے لئے کتنا وقت نکال لیتے ہیں۔ پانچ وقت کی نماز و
کے لئے زیادہ سے زیادہ معہ وضو وغیرہ کے گھنٹہ سوا گھنٹہ درکار ہوتا ہے، پھر ۲۴ گھنٹے کے اندر اتنا وقت عبادت کے لئے نکال لینا
مشکل نہیں ہے جبکہ ہر یورپ کا باشندہ معصیت کے لئے کم از کم آٹھ گھنٹے روزانہ آسانی سے نکال سکتا ہے۔
علاوہ اس کے اگر آپ آسانی کے خیال کو اس قدر وسیع اور استدلال کے ذہن کو اتنا ہلکا کریں گے تو پھر یورپ کیا
معنی ہندوستان کے بھی کسی شخص پر نماز فرض نہیں رہتی کوئی آپ کے پاس آکر کہیگا کہ حضرت مجھے صبح اُٹھنے میں بہت کسل
ہوتا ہے، آپ کہدیں گے کوئی حرج نہیں، صبح کی نماز ترک کر دو، دوسرا کہیگا کہ جناب دوپہر کو لیٹنا میرے لئے ضروری ہے اور
جب میں لیٹ جاتا ہوں تو پھر چار بجے سے پہلے اٹھتا نہیں کیونکہ اگر ایسا نہ کروں تو تکلیف ہو جاتی ہے، آپ جواب دیں گے، کچھ
پرواہ نہیں، ظہر کی نماز قضا کر دیا کرو۔ اسی طرح عصر و مغرب و عشا کے لئے بھی کسی نہ کسی کو کوئی بہانہ ہاتھ آجائے گا اور آپ ہر وقت
کی نماز کو غائب کرتے جائیں گے تو یہ مذہب کیا ہوا بالکل تماشہ اور بچوں کا کھیل ہو گیا۔ کہ جو جس کے جی میں آئے اختیار کرے اور
جو چاہے ترک کر دے

میں کہتا ہوں کہ جن تین اوقات میں نماز کا ثبوت آپ کو کلام مجید سے ملتا ہے کیا اُن میں لوگوں کو کام نہیں ہوتا کیا اُن اوقات
میں کوئی سبب حاجت پیدا نہیں ہو سکتا۔ بہر حال اس نوع کے مباحث میرے نزدیک بالکل غیر مناسب ہیں البتہ خالص اعتقادات
کے باب میں وہ اپنے نفس کے اطمینان کے لئے تاویلیں کر سکتے ہیں۔ کیونکہ اس سے ہیئت اجتماعی کو کوئی نقصان نہیں پہونچتا۔
پل صراط، دوزخ جنت، حشر و نشر، معراج اور اسی طرح کے اور بہت سے ان مسائل کے متعلق جن کو عبادات و
معاملات سے کوئی واسطہ نہیں ہے کلام مجید پر غور کر کے کوئی ایسی صورت اختیار کر سکتے ہیں جو ان کے لئے مفید یقین
ہو اور میں خود بھی اس پر عامل ہوں لیکن اُن مسائل میں جن سے اسوۂ نبوی متعلق ہے میں کسی انحراف کو سخت گمراہی خیال
کرتا ہوں، وہ مسائل شرعی جن کا تعلق تمدن و معاشرت سے ہے ان میں البتہ زمانہ و وقت کے لحاظ سے تبدیلیاں ہو سکتی
ہیں کیونکہ قانون کا ضروریات کے لحاظ سے بدل جانا ضروری ہے اور جس کی اجازت خود رسول اللہ نے دی ہے کہ "رعایت
اصلح فی الشرع" کا ہمیشہ خیال رکھو لیکن وہ اعمال دینی جن سے مسلمانوں کے اجتماعی حالت وابستہ ہے ان میں کوئی تغیر نہیں ہو سکتا
اب اخیر میں مختصر سی عرض ان لوگوں سے بھی ہے، جو ان کے اس مضمون سے برہم ہیں اور وہ یہ کہ سید مقبول احمد صاحب جو
کچھ لکھ رہے ہیں خلوص و نیک نیتی سے لکھ رہے ہیں، رسول کی پوری عظمت و عزت ان کے دل میں ہے اور وہ مدعی ہیں کہ اسلام
سے بہتر مذہب دنیا میں کوئی نہیں ہو سکتا، اس لئے اگر ایسا شخص کسی بحث کے سلسلہ میں بعض باتیں ایسی بھی کہہ جائے جو
نامناسب ہیں تو اُن کو سن کر گالیاں دینا کافر کہدینا، نہایت ہی نامناسب حرکت ہے۔ اگر آپ کے نزدیک وہ غلطی پر ہیں

توان کو متنبہ کیجئے، سمجھائیے، جواب دیجئے، نہ یہ کہ ایک مجبور حریف کی طرح صرف سب و شتم پر اکتفا کیجئے۔

گزشتہ مہینے میں جس وقت انکا مضمون لکھ چکا تو مجھے خیال ہوا کہ بعض حضرات اس سے برہم ہوں گے اور ہوئے لیکن اتنا وقت نہ نکال سکا کہ اپنے اختلاف کو ذرا تفصیل کے ساتھ بیان کر سکتا، اور ملاحظات میں صرف اس قدر اشارہ کر دیا کہ:-

"سید مقبول احمد صاحب کے بعض خیالات سے مجھے اختلاف ہے"

میں ابھی اور انتظار کرتا، اگر بعض احباب کا اصرار شدید نہ ہوتا۔ افسوس ہے کہ اپنی علالت کی وجہ سے میں زیادہ وضاحت سے کام نہ لے سکا اور نہ پوری تنقید ان کے مضمون پر کر سکا، انشاء اللہ اس سلسلہ کے ختم ہونے پر اک نگاہ اس پر ڈالوں گا اور بتاؤں گا کہ میرے نزدیک سید صاحب سے کہاں کہاں کیا کیا لغزشیں ہوئی ہیں۔

نیاز فتحپوری

سب اشیاء کی یکجائی قیمت صرف دس روپیہ ۱۰/-

مندرجہ ذیل پانچوں اشیاء کی قیمتوں کا میزان اٹھارہ روپیہ ہوتا ہے لیکن سب اشیاء یکدم طلب کرنے پر معہ محصولڈاک پیکنگ صرف دس روپیہ میں روانہ کیجاویں گی۔ آٹھ روپیہ کی رعایت آپ منتخب ہوں ہمارا منشاء قلیل منافع پر بہترین اشیاء خریداروں کو ... پہنچانا ہے ...

کارآمد فاؤنٹن پن ولایت کی جدید ساخت ہے ایک مرتبہ سیاہی بھر کر صفحہ کے صفحہ لکھ ڈالئے۔ گولڈن نب لگا ہے ... نہایت روانی سے چلتا ہے اور برسوں کام دیتا ہے۔ قیمت معہ محصول ڈاک ۱۲/-

ڈبل الارم ٹائم پیس

گارنٹی ... دو گھنٹی کی بلند آواز سے آپکو ٹھیک وقت پر بیدار کریگا وقت ہمیشہ صحیح بتائیگا بغیر گھڑی ساز کی مدد کے برسوں کام دیگا یہی وجہ ہے کاریگر کو اسکی مشین پر بہت ناز ہے۔ قیمت علاوہ محصولڈاک چار روپیہ

لیور پاکٹ واچ

گارنٹی ۵ سال

ایک مستند کاریگر کی ساخت ہونیکے باعث مشین کی مضبوط، وقت کی پکی، دیکھنے میں خوبصورت ہے۔ قیمت معہ محصولڈاک پانچ روپیہ ۵/-

نفیس رسٹواچ

گارنٹی ۷ سال

۲۲ کیرٹ گولڈ پلیٹیڈ رسٹواچ اپنی خوبی میں پچاس روپیہ کی گھڑی کا مقابلہ کرتی ہے از حد خوبصورت اور بہت پائدار ہے کاریگر کی جدید ساخت ہے۔ قیمت معہ محصول ڈاک چھ روپیہ ۶/-

سنہری خولدار چوڑیاں

انکو اندر چمکدار رنگ برنگ کی ریشمی چوڑیاں ہونیکے باعث نیلم پکھراج کی جڑاؤ معلوم ہوتی ہیں۔ مستورات کیلئے بہترین تحفہ ہیں۔ قیمت مکمل سٹ معہ محصولڈاک ایک روپیہ آٹھ آنہ

نوٹ:- جو صاحب فاؤنٹن پن یا چوڑیاں دونوں سے کوئی ایک شے خریدنا چاہیں انکو بقیہ چاروں اشیاء صرف نو روپیہ میں روانہ کیجاویں گی نوٹ:- جو صاحب فاؤنٹن پن اور چوڑیاں دونوں اشیاء خریدنا چاہیں انکو بقیہ تینوں گھڑیاں آٹھ روپیہ میں روانہ کی جاویں گی۔

ملنے کا پتہ:- اچیپ واچ ہاؤس اجمیری گیٹ ۱۷ دہلی

مراثی انیس کے حیدرآبادی اڈیشن کے حیدرآبادی نہ ہونے پر اصرار

گزشتہ ماہ کے رسالہ میں جناب احسن لکھنوی کا مضمون جو "مراثی انیس کے حیدرآبادی اڈیشن" کے عنوان سے شائع ہوا ہے اُس کو دیکھکر جناب سید محمد قادری بی اے حیدرآبادی نے ایک مکتوب ہمارے پاس بھیجا ہے جو ذیل میں درج ہے:۔

محترمی۔ تسلیم

اس سے قبل ایک خط آپ کو لکھ چکا ہوں۔ اس کے جواب کا منتظر ہی تھا کہ کل نگار نظر افروز ہوا۔ رات کھانا کھانے کے بعد مطالعہ کرنے لگا تو "مراثی انیس کا حیدرآبادی اڈیشن" والے مضمون پر سب سے پہلے نظر پڑی۔ فاضل مضمون نگار مولانا احسن مارہروی صاحب نے واقعی نہایت کارآمد چیز کی طرف توجہ دلائی ہے۔ انیس جیسے شاعر کے ساتھ ہماری یہ بے پروائی یقیناً قابل ملامت ہے۔ اس سلسلہ میں مولانا سے ایک خفیف سی فروگزاشت ہوگئی ہے جو اندیشہ ہے کہ بڑی غلط فہمی پیدا کرانے کی موجب ہوگی۔ نظامی پریس بدایوں کا ظاہراً خوشنما نسخہ کسی طرح "حیدرآبادی اڈیشن" نہیں ہوسکتا۔ دارالمصنفین کی طرح نظامی پریس نے خواہ مخواہ سرکار عالی نظام خلد اللہ ملکہ کی مالی اعانت اور سرپرستی حاصل کرنے کے لئے اپنے سلسلۂ مطبوعات کو "سلسلۂ آصفیہ" کے نام سے موسوم کر دیا ہے۔ اس اڈیشن سے حیدرآباد کا صرف یہ تعلق ہے کہ ہماری فیاض سرکار نے اردو کی دیگر تحریکات اور متعدد تالیفات کی طرح اس کی بھی معقول مالی امداد فرمائی ہے اتنا تعلق اس کو "حیدرآبادی اڈیشن" بنانے کے لئے کسی طرح کافی نہیں میرے سامنے اس وقت مراثی انیس جلد دوم موجود ہے۔ نظامی صاحب اپنی تمہید کے صفحہ "ب" پر واضح طور پر لکھتے ہیں "میر صاحب کے ان جواہر پاروں کو اس خوبصورتی اور اہتمام کے ساتھ اردو دان پبلک کے سامنے پیش کرنے کی ہمت افزائی اور سرپرستی اعلیٰ حضرت بندگان عالی حضور نظام ..... کی سرکار کی طرف سے ہوئی ہے۔"

اس اڈیشن کی بظاہر خوشنمائی سے قطع نظر معنوی حالت جو کچھ ہے وہ آپ سے پوشیدہ نہیں۔ میں اس پر کچھ عرض کرنا نہیں چاہتا۔ میر انیس مرحوم اور انکی اولاد اکثر حیدرآباد آتی رہی۔ اُن کے مراثی یہاں بھی بعض اصحاب کے پاس محفوظ ہیں۔ اگر مولانا احسن صاحب اس کام کو عام طور پر اعلان ارادہ کر کے شروع فرمائیں تو اُمید ہے کہ ضرور حیدرآبادی اصحاب انکی مدد کریں گے۔ بہرحال یہ اڈیشن کسی طرح "حیدرآبادی اڈیشن" نہیں کہلا سکتا۔ اگر آپ مبالغہ نہ خیال فرمائیں تو میں سمجھتا ہوں کہ اس سے حیدرآباد کی علمی نیک نامی پر مضر اثر پڑے گا۔ آپ کی

عنایات سے توقع ہے کہ اس بارہ میں "ملاحظات" کے تحت نوٹ دیکر اس غلط فہمی کا ازالہ فرمادیں گے۔

سید محمد قادری بی، اے

صاحب موصوف کی فرمائش ہے کہ میں ملاحظات کے تحت نوٹ دیکر اس غلط فہمی کا ازالہ کردوں۔ لیکن چونکہ ملاحظات میں اتنی گنجائش نہیں نکل سکتی تھی اس لئے اس مکتوب کو علحدہ درج کرکے، غلط فہمی کا ازالہ تو نہیں البتہ اس امر کی توثیق کرنا چاہتا ہوں کہ اس نسخہ کو حیدر آبادی اڈیشن کے سوا کچھ اور کہہ ہی نہیں سکتے۔

آپ نے اول تو یہ بالکل غلط سمجھا کہ اس مضمون کے لکھنے والے احسن مارہروی ہیں۔ مضمون کے اخیر میں احسن لکھنوی کے الفاظ نہایت صاف صاف درج ہیں، علاوہ اس کے تمہید ہی سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس مضمون کا لکھنے والا وہی ہے جس نے "واقعات انیس" لکھے اور یہ دنیا کو معلوم ہے کہ "واقعات انیس" مارہرہ کی پیداوار نہیں بلکہ لکھنؤ کی چیز ہے۔ علاوہ اس کے یوں بھی سمجھنا چاہئے تھا کہ مراثی انیس پر ناقدانہ یا مصححانہ نگاہ ڈالنا مارہرہ، فتحپور یا حیدر آباد کے کسی فرزند کا کام نہیں بلکہ اس کو وہی شخص کرسکتا ہے جو لکھنؤ کی عہد انیس کی زبان و معاشرت سے واقف ہو اور یہ فخر لکھنؤ میں بھی اب صرف چند نفوس کو حاصل ہے۔

جناب "نظامی عفی عنہ" نے اپنے مقدمہ یا تمہید میں جو مراثی انیس جلد اول کے اول میں شامل ہے نہایت کھلے الفاظ میں تحریر فرمایا ہے کہ:۔

> اساتذہ اردو میں میر ببر علی صاحب انیس کے کلام کا پڑھنا سمجھنا پرکھنا اس سے زبان و طرز بیان کا سیکھنا اُن کا تتبع کرنا ان کے نقش قدم پر چلنا ہر شاعر و ادیب جو واقعہ نگار ہو سرمایۂ افتخار سمجھتا ہے فارسی ترکیبوں میں اُن کے تصرفات ایک اوستاد زمانہ ہونے کی حیثیت سے اردو میں قابل اسناد ہیں اس اہمیت کو مد نظر رکھ کر جناب سید راس مسعود صاحب بی اے (اکسن) ناظم تعلیمات دولت آصفیہ نے اپنی اسکیم کی دوسری قسط کے طور پر اس کے شائع کرنے کی ضرورت محسوس فرمائی اور اعلیحضرت قدر قدرت معز اکجز الشانہ ہائی نس آصف جاہ جہاں پناہ ظل اللہ سپہ سالار مظفر الممالک نظام الملک محی الملتہ والدین نواب سر میر عثمان علی خاں بہادر نظام الدولہ فتح جنگ بالقابہ سلطان دکن خلد اللہ ملکہ کے شاہانہ عطیہ سے جو مستند شعرائے اردو کے کلام کی اشاعت کے لئے سید صاحب موصوف کی درخواست پر مرحمت ہوا تھا مراثی انیس کی پہلی جلد شائع ہونے کی نوبت آئی اس جلد میں میر صاحب کی آخر عمر کا کلام ہے اور اس میں بعض وہ مراثی ہیں جو اب تک طبع نہیں ہوئے درحقیقت یہ جلد میر صاحب کے اُس کلام کا مجموعہ ہے جس کی نسبت اُنھوں نے خود فرمایا ہے ؎
>
> گھٹا زور مشق سخن بڑھ گئی ضعیفی نے ہم کو جواں کردیا

سید علی حیدر صاحب نظم طباطبائی المخاطب بہ نواب حیدر یار جنگ نے اس جلد کی ترتیب و تصحیح کی خدمت کو انجام دے کر ملک پر بالعموم اور اردو دان پبلک پر بالخصوص احسان فرمایا ہے۔ آغا سید حسن صاحب بی اے صدر مہتمم تعلیمات بلدہ (حیدرآباد) بھی شکریہ کے مستحق ہیں جنھوں نے میر صاحب کا اصلی فوٹو عنایت فرمایا جس کے بغیر یقیناً یہ مجموعہ نامکمل رہتا۔

اُمید تھی کہ اس جلد کے قابل مرتب مولانا طباطبائی صاحب اس کا مقدمہ لکھ کر اپنے کامل الفن ہونے کی حیثیت سے فن مرثیہ گوئی اور شاعری کے متعلق مفید معلومات کا ذخیرہ جمع کر دیں گے جس سے ناظرین کو میر انیس اور ان کی شاعری کے متعلق صحیح رائے قائم کرنے میں مدد ملیگی لیکن ہماری بدقسمتی سے مولانائے موصوف اپنی پیرانہ سالی اور مصروفیت کی وجہ سے ہماری خواہش کو پورا نہ کر سکے انھوں نے اپنے ایک نوازشنامہ کے چند فقروں میں اس جلد کی خصوصیات کا جو ذکر فرمایا ہے اس موقع پر اس کا نقل کرنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا وہ لکھتے ہیں۔

اس جلد میں میر صاحب مرحوم و مغفور کے یا تو وہ مرثیے ہیں جن میں مصنف نے خود صراحتاً یا اشارتاً یہ بات ظاہر کر دی ہے کہ اُن کی آخری عمر کا کلام ہے یا وہ مرثیے ہیں جو آخر عمر میں نواب ابو صاحب کی مجلسوں میں جناب مرحوم نے پڑھے اور یہی مرثیے مرحوم کے بستے میں تھے۔ جس دن جناب مرحوم نے منبر و مجلس کو الوداع کہی تینوں صاحبزادے سامنے حاضر تھے چھوٹے فرزند میر محمد صاحب سلیس کو اشارے سے پاس بلایا بستہ اپنے ہاتھ سے اُٹھا کر ان کے ہاتھ میں دیدیا سلیس مرحوم ٹیاپرج و حیدرآباد کی مجلسوں میں زندگی بھر یہی مرثیے پڑھا کئے۔ یہ مرثیے منشی نولکشور کو نہ ہاتھ آسکے کہ ان کی مرتب کی ہوئی جلدوں میں شامل ہو جاتے اس کے علاوہ دو یا تین مرثیے ایسے بھی ہیں جن کا حال مجھے اپنے بزرگوں سے معلوم ہوا کہ یہ جناب مرحوم کے انتہائے مشق کا کلام ہے لوگوں کی خاطر سے مرحوم کو یہ مرثیے بستے سے جدا کرنے پڑے"۔

مولانا طباطبائی کی طرف سے دیباچہ یا مقدمہ لکھنے کے متعلق جب مایوسی ہوگئی تو میں نے اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی۔ سو ہو ہوا۔

اس "سو ہو ہوا" کے بعد جو کچھ خامہ فرسائی کی گئی ہے اس سے ہمیں بحث نہیں کیونکہ اس کا تعلق صرف جناب "نظامی عفی عنہ" کے زور قلم و اجتہاد فکر سے ہے واقعات سے نہیں۔

- کیا اس تحریر کے بعد کوئی شخص انکار کر سکتا ہے کہ مراثی انیس کا یہ اڈیشن، حیدرآبادی اڈیشن نہیں ہے۔ ریاست نظام کا ایک ایسا شخص جس کے ہاتھ میں وہاں کے علم و ادب کا نظم و نسق ہے، مراثی انیس کی اشاعت کے لئے ایک

ایک شاہانہ عطیہ کی سفارش کرتا ہے، اعلیحضرت جو فطرتاً علم دوست واقع ہوئے ہیں اس کی ضرورت کو محسوس کرکے اس سفارش کو منظور فرماتے ہیں اور متوسلین حیدرآباد میں سے نظم طباطبائی ایسا شخص جو لکھنؤ کے نہ صرف مخصوص فضلاء و ماہرین ادب میں شمار کیا جاتا ہے۔ بلکہ عہد انیس کے واقعات، حالات، زبان، محاورات اور معاشرت و تمدن سے پوری طرح واقف ہے اس کی ترتیب و تصحیح کی خدمت کو انجام دیتا ہے، اور پھر بھی اس پر اصرار ہے کہ اس نسخہ کو حیدرآبادی اڈیشن نہ کہا جائے کیونکہ وہ اغلاط سے لبریز ہے اور اس حقیقت کا اظہار حیدرآباد کی علمی نیک نامی کے لئے مضر ثابت ہوگا۔

کیا ایسی کتاب جس میں روپیہ، سفارش، تصحیح و ترتیب سب حیدرآباد کی ہو اس کو صرف اس بنا پر کہ وہ بدایوں میں طبع ہوئی ہے، حیدرآبادی ہونے سے خارج کردیتا ہے، میں نہیں سمجھ سکتا کہ اس سے زیادہ حیدرآبادی اڈیشن ہونے کے لئے اور کیا اسباب ہوسکتے ہیں۔ اگر یہ کتاب حیدرآباد ہی میں شائع ہوتی تو بھی بہرحال مسعود یار جنگ اور مولانا طباطبائی ہی اس کے مہتمم و مصحح و مرتب ہوتے اور وہی اب بھی ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ محض بدایوں میں چھپنے کی وجہ سے کیوں اس کو حیدرآباد سے "خارج البلد" کیا جاتا ہے۔

میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ اس کتاب سے اعلیحضرت حضور نظام کی علم پروری یا حیدرآباد کی علمی خدمتوں پر مضر اثر پڑ سکتا ہے کیونکہ یہ دونوں باتیں تو اب حقایق مسلمہ میں داخل ہیں اور ان سے کسی کو انکار ہی نہیں ہوسکتا، لیکن یہ یقینی ہے کہ اعلیحضرت حضور نظام کے اس شاہانہ عطیہ کا مصرف بالکل غلط ہوا اور وہ مقصود پورا نہ ہوسکا، جس کو سامنے رکھ کر سفارش کی گئی تھی، اور جس پر اعتماد کرکے اعلیحضرت نے امداد منظور فرمائی تھی۔

میں بہت مسرور ہوا کہ آپ نے یہ خط بھیجکر مجھے موقعہ دیا کہ اس مسئلہ پر اصولی گفتگو کروں کیونکہ میرے نزدیک اس وقت تک حیدرآباد کا مراثی انیس کی طرف سے غافل رہنا ایک ایسی فروگزاشت ہے جس کی طرف جلد سے جلد توجہ کرنے کی ضرورت ہے، میں نے حیدرآباد کی تخصیص اس لئے کی کہ اس وقت وہی مرکز ہمارے علوم و فنون کا ہے اور وہیں کی شاہانہ فیاضیاں ہمارے ضایعات کی تلافی کرسکتی ہیں۔

اگر آپ اور دیگر حیدرآبادی حضرات کچھ مدد کرسکتے ہوں تو کہئے۔ میں شوق سے مستقلاً یہ سلسلہ قایم کرنے کے لئے طیار ہوں اور جناب احسن لکھنوی کو بھی آمادہ کرونگا کہ وہ اپنے خاندان کے تمام محفوظ بستوں کو نکال کر جس قدر کلام انیس شایع ہوچکا ہے اس کے ایک ایک نقطہ پر نگاہ ڈال کر صحت کی طرف متوجہ ہوں۔

نظامی پریس کی دوسری جلد مراثی انیس کی ابھی تک میری نظر سے نہیں گزری، لیکن اگر یہ سلسلہ قائم ہوگیا تو پھر اس کا دیکھنا بھی ناگزیر ہوگا۔ بہرحال آپ کی طرف سے جو امداد اس بابت میں ہوسکتی ہے اس سے مطلع فرمایئے تاکہ میں تمام آسانیوں اور دشواریوں پر نگاہ کرکے اس سلسلہ کو شروع کردوں۔

نیاز فتحپوری۔

باب الاستفسار

(بعض سیاسی مسایل)

(جناب غلام علی خاں صاحب اٹک)

رسالہ نگار برابر دیکھتا رہتا ہوں اور دل ہی دل میں آپ کی محنت کی داد دیدیا کرتا ہوں۔ اگر ناگوار نہ ہو تو ایک رائے پیش کردوں اور وہ یہ ہے کہ نگار میں کوئی حصہ سیاسیات کا نہیں ہوتا چونکہ مجھے اس سے بہت دلچسپی ہے اس لئے بہت جی چاہتا ہے کہ مختلف مسائل میں آپ کی رائے بھی معلوم کرتا ہوں کیا یہ ممکن نہیں کہ ہر مہینے اس میں چند صفحات اس کے لئے الگ کردئے جائیں اور ان میں سیاسی مضامین درج ہوتے رہیں۔ بہرحال اس وقت میں معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ مہاتما گاندھی کو آپ کیسا سمجھتے ہیں۔ مسایل عدم تعاون، ستیاگرہ، کھدر پوشی اور مجالس خلافت، تبلیغ، مسلم لیگ اور کانگرس کے متعلق جناب کی کیا رائے ہے۔ مدعا یہ ہے کہ میں آپ کی سیاسی معتقدات معلوم کرنا چاہتا ہوں۔

(نگار) ایک زمانہ سے یہ مسئلہ میرے سامنے ہے کہ نگار میں کم از کم دس صفحے سیاسی شذرات کے لئے مخصوص ہوں، لیکن ظاہر ہے کہ یہ حصہ بھی استفسارات، معلومات، ملاحظات وغیرہ کی طرح مستقلاً مجھی کو پورا کرنا پڑے گا، اس لئے اس ذمہ داری کو لیتے ہوئے گھبراتا ہوں، اس لئے نہیں کہ محنت سے جی چراتا ہوں، بلکہ محض اس بنا پر کہ وقت کہاں سے لاؤں، آپ یقین کیجئے کہ اخبارات ورسایل پر ایک سرسری نگاہ ڈالنے کی بھی فرصت مجھے حاصل نہیں ہے، بہرحال یہ امر یقینی ہے کہ کبھی نہ کبھی کوئی اہل شخص میرے مشاغل کا بار سنبھالنے کے لئے مل ہی جائے گا اور میں آپ کے اس نہایت مفید وضروری مشورہ پر عمل کرسکوں گا۔

مہاتما گاندھی کو میں اس زمانہ کا سب سے بڑا انسان سمجھتا ہوں یہاں تک کہ کوئی شخص کوشش وسعی کے باوجود بھی ان کے مرتبہ کو نہیں پہونچ سکتا۔ ان کی سیاسی تعلیم اس قدر زبردست ہے کہ اگر کوئی جماعت اس پر عمل کرسکے تو اپنے اندر ایک ایسی بے نیازانہ قوت پیدا کرسکتی ہے کہ اس کے سامنے سارے عالم کی مادی قوت سپر ڈالنے پر مجبور ہو جائے، لیکن اسی کے ساتھ میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ مہاتما گاندھی کی تقلید آسان کام نہیں اور ایک ملک حد درجہ سیاسی ابتلا سے گزرنے کے بعد ہی اس میں کامیاب ہوسکتا ہے۔ مہاتما جی جس چیز کو اس وقت پیش کر رہے ہیں وہ غالباً پچاس برس کے بعد قابل عمل ہوگی اور ہرچند اس وقت وہ تو موجود نہ ہوں گے، لیکن ان کی تعلیمات زندہ ہونگی اور ملک انھیں پر کاربند ہوکر

منزل مقصود تک پہونچ سکیگا۔ عدم تعاون اور ستیاگرہ میں کوئی فرق نہیں ہے۔ ایک دوسرے کو مستلزم ہے اور یہی اصل روح گاندہی جی کی تعلیم کی ہے۔ کھدر کے استعمال کی برکتیں ہر شخص پر روشن ہیں اور اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا، لیکن میں نے جہاں تک غور کیا ہے اس سلسلہ میں "دوچار بہت سخت مقام آتے ہیں"۔ چونکہ ہم لوگ نہایت سطحی تعلیم و تربیت رکھنے والے ہیں اس لئے بعض اوقات بعض نفوس بالکل غلط اثر قبول کرتے ہیں۔ کھدر کے استعمال کا جو اقتصادی فائدہ ہے وہ تو خیر ظاہر ہی ہے لیکن اس میں ایک نوع کی روحانی تعلیم بھی مضمر ہے اور وہ یہ کہ انسان اپنے آپ کو غریبوں کی سطح پر لے آئے اور انکے ساتھ ہمدردی کرے لیکن اس پہلو پر بہت کم لوگوں نے نگاہ کی اور کھدر پوشی حقیقتاً ایک ذریعہ اور عجب و غرور کا بن گیا۔

میرے سامنے ایسی مثالیں ہیں کہ بعض نوجوان اس کا استعمال صرف اس لئے کرتے ہیں کہ اس کی سفید ملاحت اُن کے گورے رنگ اور داڑہی مونچھ منڈے ہوئے صاف و صبیح چہرہ پر ایک خاص کیفیت پیدا کر دیتی ہے اور اکابر قوم میں ایسے تو متعدد ہیں جو کھدر پہننے کے بعد بجائے اس کے کہ وہ اپنے اندر انکسار و افتادگی پیدا کریں اپنے آپ کو ایسی عظیم و بلند ہستی سمجھنے لگتے ہیں کہ پھر مشکل ہی سے کوئی شخص قابل التفات ان کو نظر آتا ہے اور ان کی مسرت کی کوئی انتہا نہیں رہتی جو اُن کو اس لباس میں دیکھکر کوئی ارادتمند "مولانا" کہکر ہاتھ چومنے کے لئے بڑھتا ہے اور یہ ایک ایسے عجز کے ساتھ جس میں فرعون کا غرور پنہاں ہوتا ہے اپنا ہاتھ بڑھا دیتے ہیں اور ایسے لب و لہجہ میں گفتگو شروع کرتے ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ کائنات کا نظام اُنھیں کی ذات پر منحصر ہے اور اگر آج یہ سیادت و قیادت چھوڑ دیں تو شاید نظم عالم درہم برہم ہو جائے۔

یہ لوگ کھدر کے لباس میں بھی قصداً بدترتیبی اور بھوہڑپن پیدا کرتے ہیں، ارادتاً پیوند لگے ہوئے بوسیدہ اور میلے کپڑے کھدر کے استعمال کرتے ہیں تاکہ عالم کی طرف سے بے نیازی، لوگوں کی جانب سے بے ہمگی، اور امور دنیا میں ایک خاص قسم کا الھڑپن ظاہر ہو اور اس طرح لوگ ان کی طرف زیادہ مایل ہوں

آپ اگر جستجو کریں گے تو معلوم ہوگا کہ کھدر پوشوں کی وہ جماعت جو ذرا بلند تعلیم یافتہ طبقہ سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کے اکثر افراد اس عذاب میں مبتلا ہیں اور جس وقت وہ موٹر میں بیٹھکر باہر نکلتے ہیں تو ہر چند بظاہر ان کا ملبوس جس کو قصداً اُنھوں نے تار تار کر دیا ہے، حد درجہ انکسار کو ظاہر کرتا ہے۔ لیکن ان کے نفس میں اس وقت اتنا سخت غرور بھرا ہوتا ہے کہ مشکل ہی سے کسی مستبد حکمراں میں پایا جا سکتا ہے۔ بہرحال کھدر پوشی کا یہ مکروہ و مبغوض پہلو یقیناً سخت لعنت ہے لیکن محض ایسے خود نما و خود فروش مکاروں کی وجہ سے اصولاً اُس کو نہ بُرا کہا جا سکتا ہے اور نہ اس کے ترک کی ترغیب دلائی جا سکتی ہے۔

(۲) مجلس خلافت اب بالکل لایعنی اور بیکار سی انجمن ہے، کیونکہ جب خلافت کا وجود ہی باقی نہیں رہا اور اس مصیبت سے عالم اسلامی آزاد ہو گیا تو پھر سانپ نکل جانے کے بعد لکیر کا پیٹنا کیا معنی رکھتا ہے اگر یہ کہا جائے کہ اب مجلس خلافت سے مقصود صرف ایک ایسی تنظیم کا قایم رکھنا ہے جو مسلمانوں کو ایک شیرازہ سے وابستہ رکھے تو اس کے لئے کوئی اور نام تجویز

کرنا چاہئے موجودہ نام سراسر دھوکا ہے، اگر اس نام کے جواز کے لئے یہ تاویل پیش کی جائے کہ ہر چند مسئلہ خلافت اب باقی نہیں رہا ہے، لیکن حرمین تو موجود ہیں، وہاں کے مسایل سے تو مسلمانوں کو واسطہ ہے تو میں اس کو اصولی غلطی کہونگا۔ کیونکہ ہندوستان کے مسلمانوں کو عراق و حجاز، ترکی و ایران وغیرہ کی سیاسیات سے بحث کرنا یا محض سیاسیات خارجہ کے لئے ایک مستقل انجمن قائم کرکے اپنی ملکی سیاسیات کو پس پشت ڈالدینا بالکل خلاف عقل ہے۔ ہر ملک اپنے مصالح کو بہتر سمجھ سکتا ہے۔ اور ہماری چیخ پکار سے نہ صرف یہ کہ کوئی فائدہ اس کو نہیں پہونچتا بلکہ بعض اوقات برا نتیجہ پیدا کرتا ہے۔ مسلمانوں کو سب سے پہلے اپنی ملکی حالت پر غور کرکے اپنے لئے کوئی طریق عمل پیدا کرنا چاہئے اور جب اس سے فارغ ہو جائیں تو پھر گھر سے باہر کی آگ کو دیکھنا چاہئے۔

مذہبی تنظیم کے لئے بیشک ہر ضلع اور صوبہ میں ایک صدر الاسلام یا شیخ الاسلام کا تقرر ضروری ہے جس کے ہاتھ میں تمام مسایل مذہبی اور خصوصیت کے ساتھ فراہمی و صرف زکوٰۃ کا انتظام ہو۔ سو اس کے لئے مجلس خلافت کے قیام کی ضرورت نہیں ہے بلکہ از سر نو ایک مذہبی انجمن قائم کرنا لازم ہے۔

مسلم لیگ اس سے زیادہ بے معنی چیز ہے، کیونکہ مذہبی نقطۂ نظر سے وہ بیکار محض ہے، اور سیاسیات کے لحاظ سے اس کا کانگرس سے علیحدہ رہنا، گویا مسلمان اور ہندو میں ایک دائمی تفریق کا سبب پیدا کرنا ہے، تبلیغ کے لئے جتنی انجمنیں جہاں قائم ہیں میں ان سب کا سخت مخالف ہوں اور ایسے اخبارات و رسائل کو میں ملک کا شدید ترین دشمن سمجھتا ہوں جو تبلیغ اسلام کا علم بلند کئے ہوئے نظر آتے ہیں۔

سب سے پہلے اصولی غلطی مسلمانوں سے یہی ہوئی کہ انھوں نے شدھی اور سنگھٹن کے مسلہ کو اہمیت دی اُن کو صرف سکوت اختیار کرنا چاہئے تھا۔ لیکن چونکہ ملک کے بعض افراد ایسے ہیں جو حصول زر اور جلب منفعت کے لئے ایسی فرصتوں کی جستجو میں رہتے ہیں، اس لئے وہ ایسے زریں موقعہ کو کیونکر ہاتھ سے جانے دیتے اُنھوں نے ایک ہنگامہ شدھی کے خلاف پیدا کرکے ہندوستان کی سیاسیات میں اس قدر نزاکت پیدا کردی کہ اب عرصہ تک اس کا سنبھالنا دشوار ہے۔ میں جانتا ہوں کہ شدھی کے مسئلہ کو چھیڑنا ہندوؤں کی زیادتی اور غلطی ہے، لیکن کسی زیادتی یا غلطی کا جواب ہمیشہ غلطی اور زیادتی ہی سے نہیں دیا جاتا۔

کانگرس ہی صحیح معنے میں ایک سیاسی انجمن ایسی ہے جس میں مسلمانوں کو حصہ لینا چاہئے اور پوری قوت کے ساتھ یہ عذر کہ اس میں ہندو زیادہ ہیں اور ان کی اکثریت مسلمانوں کے بہت سے جائز حقوق کو پامال کردیتی ہے ناقابل قبول ہے کیونکہ اگر آپ چاہیں تو اپنی قوت و کثرت عزم و انہماک سے اپنے آپ کو برابر کا حصہ دار بنا سکتے ہیں، لیکن مسلمانوں کو خلافت، تبلیغ وغیرہ کے مہمل قصوں جھگڑوں سے کہاں فرصت ہے کہ وہ کوئی صحیح فیصلہ کرسکیں، رہ گئے ہمارے رہنما اور ہادی، سو ان کے متعلق سکوت ہی بہتر ہے کیونکہ اگر آج وہی کسی کام کے ہوتے تو یہ بے راہ روی اور مسلمانوں کے انحطاط کی یہ "روز افزونی" کیوں پیدا ہوتی۔

نیاز فتحپوری

قطرۂ اشک

ابر بہار خیمہ زن وادیٔ کوہسار میں! — حسنِ ازل تھا جلوہ گر منظرِ سبزہ زار میں
غنچۂ دل مہک اٹھا زلفِ سحر کے عطر سے — گلشنِ ناز تھا نہاں بادِ صبا کے پیار میں!
جلوۂ حسن مضطرب موجِ صبا کے عکس میں! — وحشتِ عشق بے نقاب دامنِ گل کے تار میں
شوق کا کارواں تھا گم دشتِ سکوتِ صبح میں — تارِ نگہ گندھا ہوا ابر کے سرخ ہار میں
جنبشِ چشم ملتفت منظرِ عام کی طرف! — مقصدِ دل چھپا ہوا جلوۂ روئے یار میں
دیکھا اٹھا کے جب نقاب بیخودیٔ خروش کا — اور ہی کچھ نظر پڑا انجمنِ بہار میں

زلفِ دوتا کھلی ہوئی، عارضِ حسن جلوہ ریز — ایک پری کھڑی ہوئی مست کسی خمار میں
چہرہ تھا کچھ اداس سا، آنکھوں میں تھا نشانِ غم — دامنِ اشک تر بتر گریۂ بے قرار میں!
دیکھ کے ہوش اڑ گئے یاس کے اس ہجوم کو — اک گلِ تر، اور اس طرح صورتِ دلفگار میں!
شوق کی بے حجابیاں، ناز کی بے نیازیاں! — ایک ادا تھی پیار کی شرم ستم شعار میں!
چاک کیا حجابِ شرم جرأتِ اکتشاف نے! — میں نے بڑھایا اک قدم وادیٔ کوہسار میں
عرض کیا کہ "اے پری! کون ہے تو یہ کیا ہے حال — کام ہے تیرا کیا بھلا دامنِ کوہسار میں؟"
اشکِ امید ابل پڑے چشمِ الم نواز سے — موجِ حیات آگئی بحرِ امیدوار میں

بولی بصد ادا کہ "میں قطرہ ہوں ایک اشک کا — سیکڑوں حسرتیں ہیں دفن ایک مرے مزار میں
میں ہوں وہ بارشِ کرم، سبز مرے ہی دم سے ہیں — جتنے بھی نونہال ہیں گلشنِ قلبِ زار میں
مجھ سے ہی فیضیاب ہیں تشنہ لبانِ بزمِ غم! — میری ہی مے کا ہے اثر چشمِ خمار دار میں

حیف! کہ تیری آنکھ کا ایک بھی قطرہ نم نہیں! — سوز نہیں رہا ہے کیا آتشِ روزگار میں
کچھ بھی تجھے ہے پاسِ دل، کچھ بھی تجھے خیال ہے — سیکڑوں آبلے ہیں خشک پائے دلِ نگار میں

سیکھ کہیں سے طرزِ غم، ڈھونڈھ کے لا کہیں سے اشک لطفِ نظارہ کچھ نہیں ورنہ حریمِ یار میں

اتنا کہا اور اڑ گئی، دیکھتے دیکھتے پری تو کچھ بھی نہ تھا پھر اس کے بعد دامنِ کوہسار میں
سکتہ سا مجھکو ہو گیا، رہ گیا دل کو تھام کر قوتِ ضبط پھر کہاں دیدۂ بیقرار میں
فرطِ الم سے گر پڑا، مار کے چیخ خاک پر شعلۂ روح چھپ گیا برق شرارہ بار میں

نظامی بچھرایونی

بصایر

کسی نے ارسطو سے اکروز پوچھا کہ ہو دوست جاہل تو کیا ہے نتیجا
کہا اس نے جاہل ہے خود اپنا دشمن وہ کیا دوست ہوگا جہاں میں کسیکا

چلا جاتا تھا افلاطوں سرِ راہ ہوا اک شخص سائل آ کے ناگاہ
کہ زیبا کب تلک ہے کسبِ حکمت کہا جب تک ہے نا زیبا جہالت

اک معلم کو یہ بقراط نے دیکھا اکروز کہ لیاقت پہ ہے اپنی اسے دعوائے عظیم
جب پڑھاتا ہے تو کرتا ہے سلف پر ایراد ان کے دعوے نہیں کرتا کسی صورت تسلیم
بولا بقراط کہ بچوں کا پڑھانا ہے عبث جب یہ حالت ہے تو مردوں کو نہ دیجے تعلیم

جب ملے یوسف صدیق سے یعقوب حزیں پھر بھی رہتے تھے اسیطرح ملول و غمگیں
پوچھا لوگوں نے کہ اب رونے کا باعث کیا ہے اب تو پہلی سی وہ یوسف کی جدائی ہی نہیں
بولے یعقوب بچھڑنے کا تھا رونا پہلے اب یہ رونا ہے کہ مل کر نہ بچھڑ جائیں کہیں

آسی

طلسمِ خیال

(۱)

نہ فریب خوردۂ آرزو　　نہ خراب کیفِ نیاز ہوں
نہ ہلاک زہرِ وفا ہوں میں　　نہ شہید خنجرِ ناز ہوں
مجھے حسن و عشق سے کیا غرض　　کہ بعید ذوقِ مجاز ہوں
نہ محبتوں کے لئے ہوں میں　　نہ عقیدتوں کے لئے ہوں میں
مگر آجتک نہ یہ کھل سکا
کہ مجھے خیال ہے کیوں ترا

(۲)

مرا عزم وہم سے دور ہے　　ہے بلند راہ گزر مری
مرا گھر ہے عرش سے بھی پرے　　ہو کسی کو خاک خبر مری
جسے قدسیوں نے سنا نہ تھا　　اسے دیکھتی ہے نظر مری
میں تجلیوں میں مقیم ہوں　　مجھے ہوش ہے وہ کلیم ہوں
مگر آجتک نہ یہ کھل سکا
کہ مجھے خیال ہے کیوں ترا

(۳)

کہیں فلسفی کہیں منطقی　　کہیں اک طبیب لبیب ہوں
مرا لفظ لفظ ہے جاوداں　　میں وہ لازوال ادیب ہوں
یہ جہاں ہے جس سے بعید تر　　میں بہت ہی اس سے قریب ہوں
میں نگار عرش کا رازداں　　میں خدائے فرش کا رازداں
مگر آجتک نہ یہ کھل سکا
کہ مجھے خیال ہے کیوں ترا

(۴)

یہ قلم دسہ خوابگوں	مرے جاگنے کا مقام ہے
یہ طلوع مہر ضیا فشاں	مری عظمتوں کا پیام ہے
یہ ستارے اور یہ کائنات	مری زندگی کا نظام ہے
مرے دل میں عرش کی عظمتیں	ہیں رفیع تر مری وسعتیں

مگر آجتک نہ یہ کھل سکا
کہ مجھے خیال ہے کیوں ترا

(۵)

میں تو زمیں سے ہوں آشنا	سر آسماں کی خبر مجھے
میں ہر ایک بزم کا رازداں	ہے ہر اک جہاں کی خبر مجھے
تری خلوتوں کا شریک ہوں	ترے آستاں کی خبر مجھے

تری محفلوں میں گیا ہوں میں
تری منزلوں میں رہا ہوں میں

مگر آج تک نہ یہ کھل سکا	کہ مجھے خیال ہے کیوں ترا

روش صدیقی

صرف چند جلدیں باقی ہیں

اس لئے اگر نگارستان ابھی تک آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا تو اب سہی۔ دوسرا اڈیشن شائع ہونے کے لئے بھی زمانہ چاہیئے۔

حضرت نیاز کے مخصوص ادبی رنگ کے مضامین کا مجموعہ ہے اس لئے زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں قیمت عگار علاوہ محصول

ملنے کا پتہ
منیجر نگار لکھنؤ

اسلامی لغت

(مرتبہ سید حامد حسین رضوی علیگ)

جلد اول تیار ہوگئی ہے جس میں حرف "ث" تک تمام وہ الفاظ معہ مکمل تشریح و تفسیر کے درج کئے گئے ہیں جن کا تعلق مسلمانوں کے مذہبی اقتصادی جغرافی تاریخی علمی معاشرتی لٹریچر سے ہے نہایت ضروری کتاب ہے قیمت علاوہ محصول ڈاک ہے

ملنے کا پتہ
منیجر نگار لکھنؤ

عروسِ برشگال

موسم گرما سے لب پر جان بھی آئی ہوئی ۔۔۔ روئے عالم پر بھی بیڈھب مُردنی چھائی ہوئی
روحِ انسانی پر آفت اسکی بھی لائی ہوئی ۔۔۔ آسماں پر ہر نظر پڑتی تھی للچائی ہوئی

اضطراب انگیز دنیا کی ہر اک تصویر تھی
ذرے ذرے میں جہاں کے خواہش تفسیر تھی

ناگہاں دیکھا گیا ابرِ سیہ آتا ہوا ۔۔۔ اس طرح دوشِ صبا پر پیچ و خم کھاتا ہوا
جس طرح اُٹھے کوئی بالوں کو بکھراتا ہوا ۔۔۔ آمدِ فصلِ بہاری کی کھرج گاتا ہوا

گوہرِ ابرِ کرم ہر سمت بکھرانے لگا
موتیوں سے دامنِ امید بھر جانے لگا

چمکِ برقِ جہندہ باعثِ فرحت ہوئی ۔۔۔ لرزشِ موجِ نسیمِ صبح سے ہمت ہوئی
تشنگی کی شدتوں سے خلق کو فرصت ہوئی ۔۔۔ پھر شگفتہ پیکرِ عالم کی ہر صورت ہوئی

آ، بلائیں تیری لیوں اے عروسِ برشگال
اپنی آنکھوں میں جگہ دوں اے عروسِ برشگال

مرحبا اے نازنیں ناظورۂ سحر آفریں ۔۔۔ اُف تری شوخی ترے نقش و نگار دلنشیں!!
یہ نگاہِ مست تیری اور چشمِ سرمگیں ۔۔۔ دوشِ نازک پر ترے بکھری ہوئی زلفِ عنبریں

ہے ترے دامن میں پنہاں ایک لیلائے بہار
صورتِ مجنوں نہ کیوں عالم ہو شیدائے بہار

پھر نسیمِ صبح کے دامن کو اک جنبش ہوئی ۔۔۔ شاخسارِ یاسمیں کو پھر ذرا لرزش ہوئی
لالۂ مے نوش کے قدموں کو بھی لغزش ہوئی ۔۔۔ پھول برسے کھل گئیں کلیاں عجب بخشش ہوئی

چشمِ نرگس وا ہوئی تیری ہی جلووں کے لئے
کھل گئی منقارِ بلبل تیرے نغموں کے لئے

آسماں پر اب نظر آتے ہیں بادل دل کھول ۔۔۔ ہیں نشاط آسودہ سارے دشت و کہسار و جبل
کھل گئے افسردہ دل بھی اس طرح جیسے کنول ۔۔۔ میکدے میں ہو گئے میکش صراحی در بغل

پھر پپیہوں کی ہر طرف سے صدا آنے لگی
"پی کہاں" کے بھیس میں بانگِ درا آنے لگی

اودی اودی سی گھٹاؤں کا جو ہے آنچل کہیں — تو کہیں بکھرا رہی ہے زلف کوئی نازنیں ہو
ابر میں بجلی چمکتی ہے سر چرخِ بریں — آرہی ہے جھینگروں کی بھی صدائے دلنشیں

سارے دریا ہو چکے سرمستِ ریعانِ شباب
یعنی ہے سیلِ رواں میں جوشِ طوفانِ شباب

آبشاروں کے کناروں پر ہے بگلوں کی قطار — مرغِ آبی کی جھیل پر جانِ آہو ہے نثار
نغمۂ فطرت سے ہیں لبریز سارے کوہسار — جس طرف دیکھو پڑے ہیں سیکڑوں پھولوں کے ہار

حسن کی نیرنگیاں اب عشق کے دامن میں ہیں
وصل کی "سرشاریاں" اب دامنِ گلشن میں ہیں

جاذبِ نظارہ ہے کیا قوس کی رنگیں کماں — سرخوشِ کیف ترنم ہیں طیور خوش بیاں
پھول سے معشوق ہیں زینت دہِ باغِ جہاں — اپنے جامے میں سماتا ہی نہیں ہے باغباں

باصرہ افروز ہیں نیرنگیاں برسات کی
سلسبیلِ گوش ہیں موسیقیاں برسات کی

پھر لبِ غنچہ پہ لرزاں ہے شمیمِ جانفزا — باندھتا پھرتا ہے رنگِ گل ہر چمن میں اب ہوا
نغمۂ آبی سے ہے گونجی ہوئی ساری فضا — آرہی ہے آبشاروں سے ترنم کی صدا

بادۂ خوش کیف سے لبریز ہے جامِ بہار
مردہ دل بھی جی اٹھے سن سن کے پیغامِ بہار

رات کو جگنو کی تابش، جیسے آوارہ کرن — ہائے یہ افشاں کا عالم، اُف یہ زلفِ پُرشکن
ہے بپا پُرنور تاروں کی فلک پر انجمن — کر چکی لیلائے شب زریں قبا پھر زیبِ تن

چرخِ نیلی کی جبیں پھر نور افشاں ہوگئی
سیلِ انجم میں شبِ دیجور پنہاں ہوگئی

چشمہ و دریا کے ہاتھوں میں چھلکتا جام ہے — تشنہ کامانِ ارادت کے لئے پیغام ہے
پینے والے خوش ہیں جاری آج فیضِ عام ہے — انتظارِ روزِ فردا اک خیالِ خام ہے

ابتدائے رنگ و بو کی انتہا ہونے کو ہے
لمحہ لمحہ میری ہستی کا فنا ہونے کو ہے

حافظِ خستہ جگر "ماضی" پہ رکھ اپنی نظر
حال کی رنگینیوں کو رہن مستقبل نہ کر
آنے والا رنگ ہو اک حرفِ مشروط "اگر"
نقطۂ موہوم پر ہوگا ترا کبتک گزر

کل شئیٍ ہالکٌ اک آخری پیغام ہے
عالم ایجاد کا انجام کیا انجام ہے

حافظ غازیپوری

نگہ اپنی اپنی

حیات فخر ہے جس کو جناب کہتے ہیں
ہم اسکو ایک نمود حباب کہتے ہیں

علاجِ تشنہ لبی جسکو آپ سمجھے ہیں
ہم اس طلسم کو موجِ سراب کہتے ہیں

نگہ میں آپکی جو برگِ سبز ہے قبلہ
ہمارے حلقہ میں اسکو کتاب کہتے ہیں

رموز میکدۂ دل جناب کیا جانیں
جہان خیال کو جامِ شراب کہتے ہیں

جنھیں حضور کہے جا رہے ہیں خانہ خراب
انھیں کو ہم تو جلالت مآب کہتے ہیں

ہے خلق جسکے تصور سے لرزہ بر اندام
ہم اُسکو خلدِ حقیقت کا باب کہتے ہیں

عوام چشمۂ فطرت نما کہا کریں لیکن
امیں زمان و مکاں کو حجاب کہتے ہیں

نگہ بلند و دل ہوشمند میداریم
حقیقتیم و حقیقت پسند میداریم

امین حزیں

غزل

بار ہا ہجر میں یوں ہم نے انھیں یاد کیا — جسم کو روح کیا روح کو فریاد کیا
اس لگاوٹ سے نگاہوں نے کچھ ارشاد کیا — روح کو کشمکش یاس سے آزاد کیا
اس نے اس حسن تبسم سے نگاہیں ڈالیں — سب یہ سمجھے کہ سر بزم کچھ ارشاد کیا
میں نے کس دن قفس غم سے رہائی چاہی — میں نے کب شکوۂ بے مہری صیاد کیا
اُس سے پوچھے کوئی آغاز محبت کے مزے — جس کے دل کو غم انجام نے برباد کیا

بعد مدت کے خط آیا ہے کسی کا ذوقی
خیر اتنا بھی غنیمت ہے کہ اب یاد کیا

ذوقی

دواخانہ شفائی نظیر آباد لکھنؤ

سفوف اعجاز:- صرف نو دن کے استعمال سے تمام ضعیف قوتیں بالکل یقینی طور پر از سر نو واپس آجاتی ہیں۔ قیمت .... عہ

حبوب شاہی:- اس کی ایک گولی کچھ دیر قبل کھا لیجئے اور پھر دیکھئے کہ دواؤں میں کیا کیا طلسمی اثر چھپے ہوئے ہیں شیشی ۲۴ گولی قیمت .... ۶ٗ

روغن اعجاز:- اگر سفوف اعجاز کے ساتھ ۱۲ دن اس روغن کا بھی استعمال کر لیا جائے تو پھر جو کیفیت پیدا ہوتی وہ قابل بیان ہے صرف اسی روغن کا بھی استعمال اپنی جگہ اکسیر کا حکم رکھتا ہے۔ قیمت ...... ۶ٗ

سفوف نادر:- یہ سفوف خاص وقت میں ایک مرتبہ استعمال کیا جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لطف کیفیت سے غشی کی سی نوبت آجاتی ہے قیمت .... ۱۲ٗ

نمک اعجاز:- یہ بالکل نئی ایجاد ہے اور چودہ دن کے استعمال کے بعد ایک شخص کو معلوم ہو جاتا ہے کہ حقیقتاً جوانی کس چیز کا نام ہے قیمت عہ

الائچی طلسمی:- یہ چیز سوائے ہمارے دواخانے کے کہیں نہیں مل سکتی ہاں ان میں معمولی الائچی کی طرح استعمال ہوتی ہے اور چودہ دن کے بعد ایک شخص تمام دواؤں سے بے نیاز ہو جاتا ہے اگر آپ مایوس ہو چکے ہیں تو اِن کو منگا کر استعمال کیجئے قیمت ...... ۶ٗ

حبوب داؤدی:- کھانسی۔ دمہ ضیق النفس۔ بلغمی شکایات کو دور کر کے آواز کو نہایت صاف سریلا بنا دیتی ہے سینہ اور پھیپھڑوں کو نہایت مضبوط بنا دیتی ہے۔ آواز میں صفائی۔ درد اور نزاکت پیدا ہو جاتی ہے قیمت ۱۲ گولیاں ۸ٗ

منیجر دواخانہ شفائی لکھنؤ

ڈائری کا ایک ورق

(بہ سلسلۂ ماسبق)

اس سے قبل سطح قمر تک پہونچنے کا حال درج ہو چکا ہے۔ اب میں کچھ واقعات و تجربات وہاں کے بیان کرتا ہوں۔

کرۂ ارض میں سنا کرتا تھا کہ وزن نام ہے صرف کشش زمین کا اس لئے اگر کوئی کرہ، زمین سے چھوٹا ہو تو وہاں کشش کی کمی کی وجہ سے ہر چیز کا وزن بھی کم ہو جائے گا، یعنی اگر کوئی چیز کرۂ ارض میں ایک من کی ہے تو چاند میں پہونچنے کے بعد وہ صرف چند سیر کی رہجائیگی۔

جہاز پر بھی اس کا کچھ علم ہو گیا تھا جیسا کہ بیان ہو چکا ہے لیکن پوری حقیقت یہاں پہونچنے پر معلوم ہوئی۔ جس وقت ہمارا جہاز، سوشان کے میدان میں اترا تو اس کی خفت وزن کا یہ عالم ہو گیا تھا کہ سلنڈروں کی تمام قوت صرف کرنے پر بھی وہ اس طرح اترتا ہوا معلوم ہوتا تھا جیسے بلندی سے کوئی پتنگ ٹوٹ کر جھپ کھاتی ہوئی نیچے اترتی ہے۔

جب ہم سطح قمر پر اترے تو خیال تھا کہ یہاں انسانی آبادی نظر آئے گی اور کچھ اسی قسم کے آثار حیات دکھائی دیں گے جیسے زمین پر نظر آتے ہیں، لیکن ہم لوگوں کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب بجائے انسانی آبادی کے وہاں ہمنے ایک خاص قسم کے جانور دیکھے جو شکل و صورت میں تو انسان سے بہت مشابہ تھے لیکن اعضا میں بہت فرق تھا، مثلاً یہ کہ بجائے دو ٹانگوں کی اُن کے صرف ایک ٹانگ تھی اور اس کا سبب یہ تھا کہ خفت وزن کی وجہ سے انھیں اپنا جسم سنبھالنے کے لئے ایک ہی ٹانگ کافی ہوتی ہے۔

جب یہ مخلوق چلتی ہے وہ اپنی ٹانگ کو آگے نہیں بڑھاتی، بلکہ سارا جسم ایک ستون کی طرح اوپر کی طرف بلند ہوتا ہے پھر جس طرف جی چاہتا ہے وہ اوپر ہی اوپر تیرتا ہوا چلا جاتا ہے، لیکن سو دو سو قدم چلنے کے بعد وہ پھر اسی ایک ٹانگ پر اس طرح قائم ہو جاتا ہے جیسے کوئی اوپر سے زقند بھر کر نیچے آیا ہو۔ اس لئے یہ مخلوق بالکل چھلاوہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

ان کی ٹانگ گاؤدم نہیں ہوتی بلکہ صرف ایک لکڑی کی طرح برابر ہوتی ہے جسمیں کوئی جوڑ بھی نہیں ہوتا اور اسے جسم سے علحدہ بھی کر سکتے ہیں۔

یہ ٹانگ کمر سے ملی ہوئی ہوتی ہے اور کمر نام ہے صرف ایک باریک سی ہڈی کا۔ چونکہ یہاں کی زندگی کے لئے ہوا کی ضرورت نہیں ہے اس کئے پھیپھڑا بھی نہیں ہوتا اور غذا کے لئے معدہ بھی نہایت مختصر سا ہے، کیونکہ صرف رقیق چیزوں پر گزر ہے جن کا فضلہ پسینہ کی راہ سے نکل جاتا ہے اور اسی لئے امعاء وغیرہ بھی نہیں ہے۔ ہوا نہ ہونے کی وجہ سے ناک بھی ندارد ہے اور سخت چیزوں کی غذا نہ بننے کی وجہ سے دانت بھی نہیں ہیں۔ کانوں کے بجائے صرف ایک سوراخ پیشانی پر ہے اور دہن نام ہے ایک مختصر سے شگاف کا جسمیں نہ زبان ہے نہ دانت۔ آنکھیں البتہ بجائے دو کے چار ہیں دو رخساروں پر اور دو

پشت پر، ہاتھ انسانوں ہی کی طرح ہوتے ہیں لیکن نہایت کمزور۔ جنس کا فرق بھی اُن میں نظر نہیں آتا اور باوجود کوشش کے یہ نہ معلوم ہو سکا کہ سلسلۂ تناسل ان کے ہاں کس طرح قایم ہوتا ہے۔ یہ ان کے ہاں کا رازا ہے جو کسی پر ظاہر نہیں کرتے۔ ان کے تمام گفتگو سیٹیوں یا اشارات سے ہوتی ہے اور اُن کے جسم کے سنہرے بال جو جابجا کثرت سے پائے جاتے ہیں یہ گفتگو کے وقت کھڑے ہو جاتے ہیں اور دیکھنے والے پر سخت ہیبت طاری ہوتی ہے۔

جس وقت ہمارا جہاز پہونچا تو کثیر تعداد میں یہ جانور جو چاند کی اشرف المخلوقات ہونے کا فخر رکھتے ہیں چاروں طرف آ گئے اور لگے اپنے گول گول دیدے پھرا کر دیکھنے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تھوڑی دیر میں یہ لوگ لپٹ جائیں گے اور نوچ کر کھا جائیں گے۔ کپتان نے جو یہاں کے حالات سے زیادہ واقف تھا، اُس نے کچھ اشارات کی مدد سے، کچھ سیٹیاں بجا بجا کر، کبھی بیٹھ کر، کبھی اُٹھ کر اور طرح طرح کا منھ بنا کر خدا جانے ان سے کیا کہا اور وہ کیا سمجھے لیکن ہمنے صرف اس قدر محسوس کیا کہ وہ دور ہٹ گئے۔ غالباً اس نے یہی کہا ہو گا کہ یہ لوگ ڈرتے ہیں، ذرا دور ہو جاؤ، ہماری ہمسفر خاتون کی حالت نہایت خراب تھی، انھوں نے اپنے چہرہ چھپا لئے تھے اور مردوں سے لپٹی جاتی تھیں۔ میں بھی جہاز کے اندر چلا گیا اور دروازے بند کر کے سوچنے لگا کہ کتنی بڑی غلطی یہاں آنے میں کی ہے اور اب بظاہر واپسی کی بھی کوئی امید نہیں ہے۔

یہاں کی زمین بالکل کرۂ ارض کی طرح ہے لیکن فرق یہ ہے کہ سبزہ اور درخت کا پتہ نہیں جا بجا اونچی چٹانیں ضرور ہیں جن سے ہر وقت پانی بہتا رہتا ہے اور پانی کے اندر، پتھروں پر، چٹانوں کی چوٹیوں پر، نشیب و فراز میں ہر جگہ برف کے بلورات (Crystals) مختلف ہندسی شکلوں میں نظر آتے ہیں، جو دور سے ہزاروں کھلے ہوئے سفید پھولوں کی طرح معلوم ہوتے ہیں۔ اسی لئے وہ میدان جہاں ہمارا جہاز اترا تھا، تختۂ گل کے نام سے موسوم تھا، حشرات کا یہاں پتہ نہیں ہے اور نہ چوپائے کہیں نظر آتے ہیں، طیور میں صرف ایک چیز بکثرت پائی جاتی ہے اور اس کو ہم ہندوستان کے چمگادڑ سے تشبیہ دے سکتے ہیں، لیکن فرق یہ ہے کہ چاند کا یہ جانور جسم و قامت میں بہت بڑا ہے اور اس کی پروبازو بھی بہت وسیع ہوتے ہیں۔

سب سے زیادہ تکلیف دہ چیز معنوی حیثیت سے تو یہاں کی اجنبیت تھی اور ظاہری اعتبار سے یہاں کی بڑھی ہوئی سردی، آفتاب چمک رہا تھا، لیکن بجائے گرمی کے اور خنکی برساتا ہوا معلوم ہوتا تھا، ہاتھ پانوں کی ٹھٹھرن کسی طرح نہ جاتی تھی اور ایک ایک منٹ تک مسلسل آگ کے اندر ہاتھ ڈالنے کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔

یہاں نہ کوئی بازار ہے نہ کوئی شہر، یہاں کی مخلوق غاروں میں اور پہاڑوں کی چوٹیوں پر، جانوروں کی طرح زندگی بسر کرتی ہے۔ آپس میں نہ کوئی خاص اختلاط ہے اور نہ ایسی منافرت ایک ایک غار میں چار چار پانچ کی جگہ ہوتی ہے اور شب و روز میں مشکل سے چند گھنٹوں کے لئے باہر نکل کر چشموں پر جا کر پانی پی لیتے ہیں اور پھر وہیں جا کر پڑ رہتے ہیں۔

یہاں کا سب سے زیادہ دلکش مقام لیکن وہ وسیع حصۂ سمندر ہے جو بالکل خشک ہو گیا ہے اور جس میں اتنے بڑے بڑے

غار پائے جاتے ہیں کہ آج تک ان کی تھاہ نہیں ملی اور نہ یہ پتہ چلا کہ ان کے اندر کیا ہے، دوسری تفریح کی جگہ سمندر کا وہ لبریز حصہ ہے جہاں برف کی ہزاروں چادریں تیرتی پھرتی ہیں اور یہاں کی مخلوق سوار ہو کر ان سے جہازوں کا سا کام لیتی ہے اس کے اندر ایک خاص قسم کی مچھلی بالکل چاندی کی سی پائی جاتی ہے۔ اس کا شکار کھانے کی غرض سے نہیں کیا جاتا بلکہ اس کی چربی نکال کر جلاتے ہیں اور اس کی کھال کو اوڑھتے ہیں۔

سہ پہر کو جب ہم لوگوں نے باہر جانے کا ارادہ کیا، اور اس خیال سے خیموں سے باہر نکلے تو ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی کیونکہ ہر شخص کے لئے ایک چھوٹی سی گاڑی چھینکے کی طرح طیار تھی جس میں چار چار وہی چمگادڑ جتے ہوئے تھے اور ایک چلانیوالا اسی عجیب الخلقت قسم کا سامنے بیٹھا ہوا تھا۔

میں یہ دیکھکر سخت وحشت زدہ ہوا اور میں نے اسپر بیٹھنے سے انکار کیا، لیکن پیچھے مڑکر دیکھا ہی تھا کہ تین چار آدمی ایک ایک ٹانگ سے کودتے ہوئے آئے اور انھوں نے اپنے اشاروں سیٹیوں، آنکھ کی گردشوں اور ڈراؤنی شکلوں سے ایسا ڈرایا کہ میں بے اختیارانہ اس چھینکے کے اندر گر پڑا اور چمگادڑ اس کو لیکر اوپر اڑ گئے۔ میں چیخ رہا تھا، چلا رہا تھا لیکن اس جانور پر کوئی اثر نہ تھا، اور میں لٹکا ہوا اوپر فضا میں چلا جا رہا تھا، اگر اطمینان تھا تو صرف اس قدر کہ میرے اور ساتھی بھی اسی طرح آگے پیچھے چھینکوں میں لٹکے ہوئے چلے آرہے تھے۔

اندازاً دو گھنٹے کے بعد ہماری سواری پھر نیچے کی طرف مائل ہوئی اور رفتہ رفتہ ایک پہاڑی کی چوٹی پر جاکر ٹھہر گئی، میرے ساتھی بھی تھوڑی دیر میں وہیں آگئے، یہاں پہلے سے ایک جماعت سروں پر اسی مچھلی کے کھال کی لمبی لمبی ٹوپیاں پہنے ہوئے ہاتھوں میں پتھر کے نوکدار ٹکڑے لئے موجود تھی۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ ہم لوگ یہاں کے فرمانروا کے پاس جارہے تھے اور یہ سب اس کے سپاہی تھے جو ہمارے استقبال کے لئے پہلے سے موجود تھے۔

انھوں نے چاروں طرف سے ہمارا محاصرہ کر لیا اور ہم لوگ کملوں، سمور کے ٹکڑوں میں اپنے ہاتھ منہ لپیٹے ہوئے آگے بڑھے۔ اب شام ہوگئی تھی اور آفتاب کی شعاعیں پہاڑوں کی سفید چوٹیوں، میدانوں کی برفانی بلورات اور وادیوں کی شفاف چشموں پر پڑ کر بیشمار قوس قزح پیدا کر رہی تھیں، یہ منظر یقیناً اس قدر دلکش تھا کہ تھوڑی دیر کے لئے میں اپنے تمام مصائب بھول گیا اور میرے ساتھیوں میں سے بھی ہر شخص محو ہو کر رہ گیا۔

چار فرلانگ کے بعد دفعتہ، ہم کو ٹھہر جانا پڑا، کیونکہ یہاں سے اب شاہی محلات کی حدود شروع ہوتے تھے۔ میں نے خدا جانے دل میں کیا جغرافیہ ان محلات کا قایم کر رکھا تھا، لیکن یہاں پہونچکر معلوم ہوا کہ شاہی محلات عبارت ہیں صرف ان وسیع غاروں سے جو کھود کھود کر پہاڑوں کے اندر بنائے گئے ہیں۔

ان غاروں کا سلسلہ اس قدر وسیع و پیچیدہ ہے کہ اچھی خاصی بھول بھلیاں ہوگیا ہے، اور اگر کوئی واقف حال نہ ہو تو پھر ایک مرتبہ جانے کے بعد باہر نہیں نکل سکتا۔ ایک غار کے دہانہ پر پہونچکر ہم لوگ ٹھہر گئے اور اندر سے کئی آدمی مشعلیں لئے ہوئے

نمودار ہوئے، جو سپاہی ہمارے ساتھ آئے تھے وہ باہر ہی رہ گئے۔ اب ہم ایک سرنگ کے اندر جا رہے تھے جس کی چھت سے سرد پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے اور سردی کا یہ عالم تھا کہ ہڈی تک میں درد محسوس ہونے لگا تھا۔ یہ سرنگ ایک فرلانگ کی تھی اس سے نکل کر پھر ہم روشنی میں آئے لیکن اب چٹانوں کا نا متناہی سلسلہ سامنے تھا، اس کے بعد پھر دوسری سرنگ ملی۔ الغرض اسی طرح یکے بعد دیگرے پیچ در پیچ سرنگوں اور چٹانوں سے گزرتے ہوئے ایک گھنٹہ کے اندر ہم خاص قصر شاہی تک پہونچے جہاں بہت سی مشعلیں روشن تھیں۔ یہ قصر شاہی صرف ایک وسیع دالان سا تھا جو پہاڑ کو کھود کر بنایا گیا تھا۔ ایک سنگین تخت پر بادشاہ بیٹھا ہوا تھا، جس کے جسم پر بہت سی سیپیاں چپکی ہوئی تھیں اور سر کے تاج میں جو اسی مچھلی کی کھال کا تھا بہت سے رنگین پتھر جڑے ہوئے تھے، اس کی صورت بھی ویسی ہی بھیانک تھی یہ اس وقت اپنی ٹانگ الگ کئے ہوئے ایک مضغۂ گوشت کی طرح تخت پر پڑا ہوا تھا۔ ہم لوگ قریب ہو کر کھڑے ہو گئے اور اس نے مخصوص اشارات سے ہمارا خیر مقدم ادا کیا تھوڑی دیر کے بعد سنگین پیالوں میں شربت کے قسم سے ایک چیز آئی جس کو ہم لوگوں نے پیا اس کے پینے سے ہم لوگوں کی ساری تھکن دور ہو گئی اور سردی کی شدت بھی کم محسوس ہونے لگی۔ معلوم ہوا کہ یہ خاص چشمۂ شاہی کا پانی تھا جس میں عجیب و غریب اثرات پنہاں ہیں۔

اس بادشاہ کے درباری بھی سب ایک ہی وضع و صورت کے تھے اور اس وقت ان سب کی سیٹیوں اور اشارات نے ایک خاص قسم کا ہنگامہ پیدا کر دیا تھا۔

رات کو ہم لوگ یہیں رہے اور ایک غار کے اندر رہکر صبح کرنی پڑی۔ جب دوسرے دن آفتاب بلند ہوا تو پھر بادشاہ کا سلام ہوا اور انھیں سرنگوں سے گزر کر جھینکوں میں بیٹھے اب کی یہ چھینکے زیادہ بلند نہیں گئے بلکہ پہاڑوں کی سطح کے قریب قریب روانہ ہوئے، مقصود یہ تھا کہ ہم لوگ سیر کرتے ہوئے جائیں۔ جب اپنے خیموں کے محاذ میں پہونچے تو یہ چھینکے دفعۃً بہت بلند ہو گئے اور ڈرا ئور نے آہستہ سے میرے بازوؤں میں چمڑے کے دو پر جو لپٹے ہوئے تھے کسی چیز سے چپکا کر نیچے ڈھکیل دیا۔ اس کے بعد صرف مجھے اتنا ہوش ہے کہ چھینکے سے گرنے کے بعد وہ دفعۃً کھلنے شروع ہوئے اور میں طائر کی طرح آہستہ آہستہ نیچے اترنے لگا، لیکن دل اس قدر زور زور سے دھڑک رہا تھا کہ میں اس کی برداشت نہ کر سکا اور سر چکراتے چکراتے دفعۃً میں نے ایسا محسوس کیا کہ کسی چٹان سے جا کر ٹکرا گیا ہوں۔

آفتاب بہت بلند ہو چکا تھا اور میری چھوٹی بچی جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر مجھے اٹھا رہی تھی، اور سامنے کرسی پر بیوی بیٹھی ہوئی مسکرا رہی تھیں وہ پوچھ رہی تھیں کہ آج سوتے میں تم نے چیخ کیوں ماری۔ میں ان کو دیکھ کر سمجھ رہا تھا کہ یہ بھی کہیں انھیں چاند والوں میں سے کوئی نہ ہوں لیکن جب ان کی دونوں آنکھیں، دونوں کان اپنی اپنی جگہ پر ثابت و سالم نظر آئے تو میں نے اطمینان کی سانس لی اور بولا کہ جا رہی ہوں تو بتاؤں کہ کتنی بڑی مہم سر کر کے آیا ہوں۔

نیاز فتحپوری

اقتباسات و معلومات

قوتِ فکر و اجتہاد کی عجوبہ نمائیاں

سنہ ۱۸۶۹ میں ایک دن صبح کو، اک نوجوان خستہ حال، پریشان صورت، نیویارک کے باول اسٹریٹ میں جو سرمایہ داروں اور دولتمندوں کا مشہور بازار ہے، نمودار ہوتا ہے اور ٹیلیگراف کمپنی کے دفتر میں داخل ہوتا ہے۔ اس کمپنی نے خاص اشارات کہربائی مقرر کر رکھے تھے جن کے ذریعہ سے وہ شہر کے بڑے بڑے تاجروں کو گھڑی گھڑی مختلف کمپنیوں کے حصوں اور اوراق مالی کے بھاؤ کی اطلاع دیا کرتی تھی۔

یہ نوجوان اندر ایک کونہ میں بیٹھا ہوا منیجر کمپنی سے ملاقات کا انتظار کر رہا تھا کہ دفعتہً وہ آلہ جس کے ذریعہ سے خبریں پہونچائی جاتی تھیں بیکار ہو گیا۔ دو منٹ نہیں گزرے تھے کہ تاجروں کے سیکڑوں خادم گھبرا کر آ گئے اور منیجر بھی پریشان ہو کر اپنے کمرہ سے باہر ہو گیا۔ لیکن اتنی ہی دیر میں یہ نوجوان اس آلہ کے پاس پہونچکر اس کے سقم کو معلوم کر چکا تھا۔

جب منیجر اندر داخل ہوا تو اس نے بڑھ کر کہا کہ میں اس کی خرابی کو دور کر سکتا ہوں۔ منیجر نے خوش ہو کر کہا کہ "درست کرو" اور اس نے فوراً پوری مہارت کے ساتھ اسے کھولا اور جو نقص اس میں پیدا ہو گیا تھا اس کو اسی وقت دور کر دیا۔

منیجر بہت خوش ہوا اور اس کو اندر بلا کر بہت سے سوال کئے۔ جوابات سے وہ بہت خوش ہوا اور ۶۰ گنی ماہوار کے مشاہرہ پر اس کو ملازم رکھ لیا۔

آپ کو معلوم ہے یہ نوجوان کون تھا؟ یہ ٹامس اڈیسن تھا جس نے بعد کو برقی قمقمے، فونوگراف، صور متحرکہ کا آلہ اور خدا جانے کیا کیا چیزیں ایجاد کیں۔

اڈیسن کو کبھی توقع نہ تھی کہ اسے ایسی جگہ ملجائیگی، وہ بہت خوش ہوا اور اپنے اوقات کا اکثر حصہ تحقیق و تفتیش میں صرف کرنے لگا یہاں تک کہ اس نے اشارات تلغرانی کے چھاپنے کا طریقہ ایجاد کیا۔ اڈیسن اس قدر سادہ مزاج تھا کہ جس وقت کمپنی کے پریسیڈنٹ نے اس کو بلایا اور کہا کہ تم کس قیمت میں اپنی ایجادات کو بیچنا چاہتے ہو تو اس نے اپنے جی میں کہا کہ ایک ہزار گنی کہونگا اور ۶۰۰ گنی تک دیدونگا، لیکن پھر یہ خیال کر کے کہ کہیں یہ رقم بھی زیادہ نہ ہو اس نے جواب دیا کہ "مجھے معلوم ہونا چاہیے کہ کمپنی کیا دینا چاہتی ہے تاکہ میں اس پر غور کروں" پریسیڈنٹ نے کہا کہ "کمپنی آٹھ ہزار گنی دینے کے لئے تیار ہے"

اڈیسن یہ سنکر سخت متحیر ہوا اور سمجھا کہ شاید اس کے کان دھوکا دے رہے ہیں لیکن جب اس کو اس رقم کا چک مل گیا تو اسے یقین ہوا اور اس رقم سے اس نے اور بہت سے آلات خرید کئے اور دوسری ایجادات میں مصروف ہو گیا۔

اڈیسن کے حالات طفلی بھی بہت دلچسپ ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ فطرتاً نہایت جستجو پسند واقع ہوا تھا۔ جب اس کی عمر ۱۲ سال کی تھی تو کسی نے کان پکڑ کر اس کو اٹھایا جس سے اسے ثقل سماعت ہوگیا۔ اڈیسن کا بیان ہے کہ اس نے قصداً ابتک علاج نہیں کیا کیونکہ وہ اس طرح زیادہ انہماک کے ساتھ اپنے کام میں مصروف رہتا ہے اور گرد و پیش کا ہنگامہ اس کی فکر کو اپنی طرف

اردو کے دواوین

دیوان میر حسن۔ صاحب بدر منیر قیمت ۶ر
انتخاب کلیات ظفر۔ کلیات ظفر۔ بہترین انتخاب ۸ر
کلیات نظیر اکبر آبادی۔ نہایت عمدہ و صحیح عمر
کلیات صفدر۔ یعنی کلام صفدر قیمت عہ ر
دیوان داغ۔ مشہور و معروف کلام عہ ر
گلزار داغ۔ داغ مرحوم کا کلام عہ ر
کلیات اسمٰعیل۔ مولانا اسمٰعیل میرٹھی کا نہایت عمدہ
اور اعلیٰ کلام ہے قیمت .... عہ ر
مراۃ الغیب۔ یعنی منشی امیر احمد صاحب کا کلام عمر
کلیات رغب۔ نہایت اعلیٰ کلام ہے قیمت عہ ر
صنمخانۂ عشق۔ منشی امیر احمد مینائی کا دوسرا دیوان عہ ر
چمن بےنظیر۔ مختلف شعرا کا کلام ۱۲ر
ثمرۂ فصاحت۔ یعنی جناب فصاحت لکھنوی کا وہ کلام
جو ان کا سرمایۂ ناز ہے قیمت .... عہ ر
دیوان سخن۔ یعنی کلام خواجہ فخر الدین دہلوی۔ کاغذ گندہ
قیمت عہ۔ کاغذ رسمی قیمت ۱۲ر
گلدستۂ حفیظ اللہ خاں۔ اس میں متفرق شعرا کا
کلام درج ہے قیمت .... عہ ر

ذو لسانین مجمع البحرین۔ از میر مظفر علی صاحب اسیر
لکھنوی قیمت .... عہ ر

کتب عجائبات دنیا اردو

عجائب المخلوقات۔ وسیع دنیا کی بیشمار عجیب و غریب چیزیں
جن کو دیکھکر اور سنکر آدمی نقش بدیوار حیران ہوجاتا ہے اور جسمیں
معلومات کا ایک بیشبہا ذخیرہ موجود ہے۔ باتصویر رنگیں قیمت
عے ر باتصویر بلا رنگ قیمت .... للعہ ر
ایضاً فارسی باتصویر حسب قیمت بالا۔ للعہ ر
معلم السیاست۔ ترجمہ پولٹیکل اکانمی عہ ر
مطلع العجائب۔ باتصویرات رنگیں۔ اس میں بھی عجائبات
عالم کا ذکر ہے قیمت .... عہ ر
مطلع العلوم و مجمع الفنون۔ تمام علوم و فنون کا نہایت وضاحت
اور عمدگی سے ذکر کیا ہے۔ قیمت .... عہ ر
عقل و شعور۔ ایک افسانہ کے پیرایہ میں تمام علوم کا نہایت
اعلیٰ طریقہ سے ذکر کردیا ہے اس کو پڑھکر ایک مبتدی کم و بیش
تمام علوم میں کچھ نہ کچھ دسترس حاصل کرسکتا ہے۔ عہ ر
کارخانۂ عالم۔ صنعت و حرفت کے متعلق نہایت لاجواب اور
بہترین کتاب ہے جسمیں مختلف صنعتوں پر بحث کی گئی ہے عمر

ملنے کا پتہ
منیجر نولکشور پریس صیغہ بکڈپو لکھنؤ

متوجہ نہیں کرتا۔

اڈیسن کا بیان ہے کہ پونے سات بجے میں اپنا کام شروع کرتا ہوں۔ پہلے صبح کے اخبار دیکھتا ہوں اور پھر ناشتہ کرکے ٹھیک آٹھ بجے کام میں مصروف ہوجاتا ہے۔ روزانہ ۴۰ سے لیکر ۷۰ تک ایسے کام ہوتے ہیں جنھیں مجھے ختم کرنا ضروری ہوتا ہے۔ رات کو میں تمام ان مشاغل کی فہرست مرتب کرتا ہوں جو مجھے دوسرے دن انجام دینے ہوتے ہیں اور روزانہ مجھے پچاس تجربے علم الکیمیا علم الکہربا، نور وحرارت، آلات معاون وغیرہ کے کرنے پڑتے ہیں۔

پوچھنے والے نے سوال کیا کہ سب سے زیادہ مشکلات کس تجربہ میں اٹھانا پڑیں۔ تو اس نے جواب دیا کہ سب سے زیادہ زحمت مجھے برقی روشنی کے باب میں اٹھانا پڑی کیونکہ جب میں نے اس تجربہ کو شروع کیا تو مجھے کوئی علم نہ تھا کہ برقی روشنی ہو بھی سکتی ہے یا نہیں اس لئے جب میں نے اُس کے متعلق تجربات شروع کئے تو مجھے بڑی بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ مجھے یہ بھی دیکھنا تھا کہ تجارتی نقطۂ نظر سے بھی وہ اس قدر ارزاں ہوسکتی ہے یا نہیں کہ ہر شخص اس سے فاید اُٹھاسکے۔

اڈیسن کا بیان ہے کہ جب میں نے ارادہ کیا کہ برقی قمقمہ کے اندر کسی بہترین چیز کی بتی یا ڈورا استعمال کیا جائے تو میں نے ہر قسم کے کوئلہ پر تجربہ کرکے دیکھا اور جب اس سلسلہ میں مجھے بانس کے ریشہ کا خیال آیا تو میں نے جاپان، جنوبی امریکہ وغیرہ تمام مقامات میں جہاں جہاں بانس پایا جاتا ہے خاص آدمی روانہ کئے تاکہ وہاں سے ہر قسم کے بانس کا نمونہ روانہ کریں، اور اس طرح ۶ ہزار نمونے میرے پاس جمع ہوگئے اور میں نے ان سب کا تجربہ کیا یہاں تک کہ ان میں سے ایک بہترین چیز مجھے مل گئی۔ ہر چند اس تجربہ میں بیس ہزار گنی صرف ہوئیں لیکن نتیجہ کے لحاظ سے یہ رقم کچھ بھی حقیقت نہیں رکھتی۔

اڈیسن کی کامیابی کا راز اس کی مواظبت عمل ہے، یعنی جب وہ کسی کام میں لگ جاتا ہے تو پھر اس کو ترک نہیں کرتا جب تک کامیاب نہ ہوجائے اور وہ اس کے پیچھے کھانا پینا اور سونا سب ترک کر دیتا ہے۔

اس کا قول ہے کہ تاریکی اور نیند انسان کی سب سے بڑی دشمن ہیں اور میرا برقی روشنی ایجاد کرنا اسی خیال کی بناء پر تھا کہ اگر اس طرح انسان روزانہ دو گھنٹے بھی زیادہ کام کرسکے گا تو سال میں ۷۳ دن کام کے اور زیادہ ملجائیں گے۔

جب اڈیسن فونوگراف کی تکمیل میں مشغول تھا تو اس نے ایک گیت کو ۲۵۱۲ مرتبہ سنا یہاں تک کہ وہ اس کی مرضی کے مطابق ٹھیک ہوگیا۔ اس کا تجربہ جب بعد کو اس نے اپنے عمال کے سپرد کیا تو ان کی یہ حالت تھی کہ ایک ہی گیت سنتے سنتے ان کو اختلاج سا پیدا ہونے لگا تھا۔ لیکن ان کو ۲۵۰۰ مرتبہ سننا پڑا اور متواتر پندرہ دن اس میں صرف کرنے پڑے اور وہ بھی اس طرح کہ ۲۴ گھنٹے میں ایک گھنٹہ سے زیادہ سونے کو نہ ملتا تھا۔

اڈیسن کی عمر اس وقت ۸۰ سال سے متجاوز ہوگئی ہے اور اب بھی وہ روزانہ ۹ گھنٹے تجربہ گاہ میں اور ۵ گھنٹے اپنے دار المطالعہ میں صرف کرتا ہے۔

اس وقت وہ ربڑ کے مسئلہ پر غور کر رہا ہے کیونکہ اگر آئندہ جنگ ہوئی جس کا اس کو یقین ہے تو امریکہ کی موجودہ ربڑ ایک

سال سے زیادہ نہ چلیگی اور دوران جنگ میں باہر سے خام ربڑ کا آنا بند ہو جائیگا پھر سالانہ ۴ لاکھ ٹن ربڑ (جو جنگ میں صرف ہوگی) کہاں سے آئے گی۔ چنانچہ اس مسئلہ پر غور کرنے کے لئے وہ ہنری فورڈ اور ہاروی وپرسٹون سے بھی ملا جو اس وقت امریکہ کا سب سے بڑا کاروبار کرنے والا ربڑ کا ہے۔ اڈیسن کا بیان ہے کہ امریکہ میں ربڑ کے درخت اس قدر نہیں ہیں کہ ان پر اعتماد کر کے مطمئن ہو سکیں اس لئے ضرورت ہے کہ کوئی اور درخت ایسا تلاش کیا جائے جس کے اندر ربڑ کا مادہ پایا جائے اور پھر اس کی کاشت کو وسیع کیا جائے۔

چین و انگلستان

اس وقت ایشیا کے سیاسی مسائل میں چین کا مسئلہ خاص اہمیت رکھتا ہے، کیونکہ مغرب کو مشرق کی طرف سے جب کسی چیز نے مضطرب رکھا وہ چین ہی کا "زرد خطرہ" تھا اور بحالت موجودہ چین کی بیداری بہت کچھ اس خطرہ کو زندہ کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔

ہندوستان کا جغرافی تعلق چین سے اس قدر قریب ہے کہ اس سے زیادہ ہمسائگی مشکل سے نصیب ہو سکتی ہے، لیکن جہاں ہماری اور غفلتیں ہیں، وہیں ایک یہ بھی ہے کہ نہ ہم اپنے اس ہمسایہ ملک کے حالات سے واقف ہیں اور نہ وہاں کی سیاسیات سے آگاہی رکھتے ہیں۔

آج کی صحبت میں ہم بتانا چاہتے ہیں کہ چین کا تعلق انگلستان سے کب اور کیونکر ہوا اور اس نے رفتہ رفتہ کیا صورتیں اختیار کیں۔

چونکہ چین میں اجنبی لوگوں کی آمد و رفت کبھی ممنوع نہ تھی، اس لئے غیر ملکوں کے ساتھ اس کے تعلقات قدیم تاریخوں میں بھی پائے جاتے ہیں چنانچہ ۱۳۴۲ء میں غیاث الدین تغلق شاہ ہندوستان کی طرف سے ابن بطوطہ کا وہاں جانا ثابت ہوتا ہے۔ ابن بطوطہ لکھتا ہے :۔

"سلطان غیاث الدین تغلق نے مجھے سفیر بنا کر چین روانہ کیا۔ شاہ چین نے اس سے قبل سلطان غیاث الدین کے پاس ۱۰۰ لونڈیاں اور غلام، ۵۰۰ تھان کمخواب کے، ۵ من مشک، پانچ خلعت مرصع بھیجکر سلطان سے اجازت چاہی تھی کہ کوہ قراجیل کے نواح میں ایک مندر بنانے کی اجازت دیجائے"

اس کے بعد ابن بطوطہ نے چین کے حالات لکھتے ہوئے بیان کیا ہے کہ :۔ "چین میں بہت امن ہے اور ایک شخص معہ قیمتی سامان کے تنہا سفر کر سکتا ہے اور اس کو کوئی اندیشہ نہیں ہو سکتا۔ ہر ہر منزل پر ایک کاروانسرائے ہے جہاں مسافروں اور انکی سواری کے جانوروں کے قیام کا انتظام ہوتا ہے۔ اگر کوئی مسافر بعد مغرب پہونچتا ہے تو یہاں کا حاکم آتا ہے اور مسافروں کے نام لکھ کر سرائے کے دروازہ میں قفل ڈال دیتا ہے اور چلا جاتا ہے۔ صبح کو پھر آتا ہے اور ہر مسافر کو اسم وار پکارتا ہے اور حالات دریافت کر کے ایک محافظ دستہ قافلہ والوں کے ساتھ متعین کرتا ہے جو دوسری منزل تک پہونچاتا ہے اور وہاں کے حاکم کی رسید حاصل کرتا ہے کہ فلاں قافلہ خیریت سے پہونچ گیا۔ اسی طرح اکثر حصۂ ملک میں

رواج ہے۔ کاروان سرایوں میں ضرورت کی ہر چیز مہیا ہوتی ہے، خاصکر مرغ اور بط تو کثرت سے ملتی ہیں۔"

الغرض چین میں غیر ملک والوں کی آمد و رفت زمانۂ قدیم سے پائی جاتی ہے البتہ انگلستان سے اس کا سفیرانہ ارتباط اخیر سولھویں صدی میں ملکۂ الزبتھ کے عہد سے پایا جاتا ہے۔

اس کے بعد ۱۶۳۶ء میں انگلستان نے چین سے تجارتی تعلقات قایم کرنا چاہے اور ایک بیڑہ کپتان ڈڈل کی قیادت میں روانہ کیا۔ یہ بیڑہ جسوقت کنٹن کے بندرگاہ کے قریب پہونچا تو بوگیو کے قلعہ سے گولے سر کیے گئے، لیکن انگریزی بیڑہ کی توپوں نے ان کی توپوں کو خاموش کر دیا اور اس طرح یہ بیڑہ کنٹن پہونچا اور وہاں سے شکر اور سونٹھ لیکر واپس آیا۔ اس کے بعد انگلستان کے بیڑے برابر چین جانے لگے اور ہر مرتبہ یہی زحمت پیدا ہونے لگی آخرکار شاہ چین نے ۱۶۸۵ء میں انگلستان کو بحری تجارت کی اجازت دیدی اور ۱۶۸۹ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے ایک جہاز روانہ کیا تاکہ کنٹن میں ایک کارخانۂ تجارت قایم کرے، اس میں ایسٹ انڈیا کمپنی کامیاب تو ہوگئی، لیکن اہل چین ان انگریزوں کے ساتھ جو کنٹن میں بسلسلۂ تجارت مقیم تھے اچھا سلوک نہ کرتے تھے آخرکار ۱۷۹۲ء میں، حکومت انگلستان نے لارڈ مکرٹنی کو شاہ چین کے پاس روانہ کیا تاکہ باہمی تعلقات کو خوشگوار بنایا جائے اور بلاد چین میں انگلستان کا ایک مستقل سفارتخانہ قایم کیا جائے۔

لارڈ مکرٹنی کو شاہ چین اپنے حضور میں باریاب تو کیا لیکن کسی سبب کی بناء پر یہ سفارت انگلستان کے کامیاب نہ ہوئی

اس کے بعد ۱۸۱۶ء میں لارڈ امہرسٹ سفیر بناکر بھیجا گیا۔ جن کشتیوں میں یہ سفارت پایۂ تخت کو لیجائی گئی تھی ان کے جھنڈوں پر لکھا ہوا تھا کہ "یہ سفارت انگلستان کی طرف سے جزیہ لیکر آرہی ہے" اور جس وقت یہ لوگ پایۂ تخت میں پہونچے اسی وقت حاضری کا حکم ہوا، لیکن چونکہ یہ سفارت کے رسمی لباس میں نہ تھا اور اس کے پاس کاغذات بھی نہ تھے اس لئے اس نے انکار کیا، نتیجہ یہ ہوا کہ ناکام واپس آیا۔

اہل چین تجارتی تعلقات قایم کرنا تو پسند کرتے تھے لیکن وہ چاہتے یہ تھے کہ جو سفیر غیر ملکوں کے آئیں وہ اس طرح ملیں گویا بہت زیردست ہیں اور کم از کم انگلستان اسے منظور نہ کرتا تھا۔

رشتہ کی ضرورت

ایک مسلمان (سید) ایم اے ایل ایل بی جوڈیشل افسر تنخواہ دار ۷۰۰ روپیہ عمر ۳۷ سال ایک روشن خیال تعلیم یافتہ سلیقہ مند خوش مزاج، خوبصورت لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے، کسی قومیت یا ذات کی قید نہیں کیونکہ ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم (تم میں خدا کے یہاں عزت والا وہی ہے جو نیک سیرت ہے) تو خط و کتابت ذیل کے پتہ سے

پتہ:۔ مولوی سراج الدین احمد صاحب نمبر ۳ بیلی روڈ ڈاکخانہ کٹرا شہر الہ آباد

جب لارڈ نیپیر چین گیا تو اس نے کنٹن کے حاکم سے ملنا چاہا تاکہ اب کوئی جھگڑا تفوق کا پیدا نہ ہو اور یہ ملاقات دو برابر مرتبہ والوں کی سی ملاقات ہو اس ملاقات میں بھی یہ جھگڑا پیدا ہوا کہ کس کی کرسی کس طرف رکھی جائے بالآخر ایک گول میز کے گرد کرسیاں بچھا دی گئیں تاکہ صدر اور پائیں کا قصہ ہی باقی نہ رہے۔ لیکن لارڈ نیپیر مر گیا اور معاملات معلق رہے، یہاں تک کہ افیون کی مشہور جنگ وقوع میں آئی اور چین کا جہاز انگلستان کے جہاز نے غرق کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چین، برطانیہ کو اپنا مساوی سمجھنے لگا اور برطانوی تجار کو اب کوئی خاص شکایت نہ رہی۔ لیکن چونکہ قوت و جبروت سے حاصل کی ہوئی صلح نفرت و انتقام کے جذبہ کو اور ابھار دیتی ہے اس لئے چین کی یہ خاموشی بالکل عارضی و اجباری تھی اور اس کے اندر ہمیشہ سے یہ اہلیت موجود تھی کہ وہ کسی وقت اپنی اہمیت کو سمجھے اور اجنبی اثرات سے اپنے ملک کو آزاد کرائے۔ چنانچہ اس زمانہ میں جبکہ وہاں حصول آزادی کے لئے ایک ہنگامہ بپا ہے، ایک امریکن کا چشم دید بیان قابل توجہ ہے۔ وہ بیان کرتا ہے کہ:-

اب جا کر دنیا کو معلوم ہوا ہے کہ چین بھی زندہ ہے اور حقیقت یہ ہے کہ جدید چین، اپنے دماغ اپنے اعصاب کی وجہ سے بہت زیادہ قابل التفات ہے۔

وطنیت کی وہ روح جو اصلی مرکز کنٹن میں پیدا ہوئی تھی اس وقت چین کے دو ثلث حصہ پر قابض ہے اور جلد وہ زمانہ آنے والا ہے جب وہ اس مقام پر پہونچ جائیں گے جہاں ... ہم چینی آبادی کو پہونچنا چاہیے۔

چین کی وطن پرست جماعت دوسری قوموں کے ساتھ سیاسی مساوات حاصل کرنا چاہتی ہے اور اس قدر قوت و عزم کے ساتھ کہ وہ سوائے اپنے کسی اور قوم یا ملک کی رائے سننا ہی نہیں چاہتی اور سارے عالم کا مقابلہ کرنے کیلئے طیار رہے۔ تنظیم میں وہ اس قدر ذوق سلیم کا ثبوت دے رہی ہے کہ اس سے قبل چین میں کہیں اس کا وجود بھی نہ تھا۔ یہ جماعت ملک کی انتہائی جنوب سے پیدا ہوئی اور شمالی ملک والوں سے ان کی معیشت و معاشرت بالکل علحدہ رہی ہے اور ان پر مغربی افکار اور مغربی تجارت کا بہت اثر ہوا ہے۔

اس تحریک کا اصل بانی سن یات سن تھا کینٹن کے قریب اس کا مکان تھا اور فطرتاً ڈیمو کریٹ (Demo-crate) تھا، یہ چاہتا تھا کہ چین کی استبدادی حکومت جمہوریت میں تبدیل کیجائے، چنانچہ ۱۹۱۱ء میں ایک ہنگامہ اُس نے اس قسم کا پیدا کیا لیکن رشوت اور عسکری قوت سے اُسے دبا دیا گیا۔ اس کے بعد سن یات سن نے ۱۹۱۶ء میں بمقام کنٹن ایک مستقل حکومت اپنے نصب العین کے لحاظ سے قائم کی۔ اس کے بعد ۶ سال تک وہ اور زندہ رہا اس دوران میں اس قدر مصائب و تکالیف اس نے برداشت کیں کہ مشکل سے اُس کو کامیاب کہا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر کوئی کامیابی اس کو حاصل ہوئی تو یہ کہ اب اس کی موت کے بعد ہر شخص اس کی عزت کرتا ہے۔ اور اس کے بوئے ہوئے تخم کو بار آور دیکھنے کا آرزومند ہے۔ چنانچہ اس وقت کنٹن کی حالت اس امید کی کامیابی کا آئینہ ہے کہ وہاں حزب وطنی

نے جو سن یات سن کی نام لیوا ہے کیسا معقول انتظام کیا ہے اور چین کے دوسرے شہروں کے مقابلہ میں وہاں کا انتظام کیسا مکمل، کس قدر مہذب و ترقی یافتہ نظر آتا ہے۔

اس جماعت میں وہی شخص شریک ہو سکتا ہے جو دمقراطیت، وطنیت اور جمہوریت کا حلف اٹھائے اور پڑھنا لکھنا جانتا ہو اس وقت تک اس جماعت میں ایک لاکھ سے زاید افراد داخل ہو چکے ہیں۔ یہی جماعت برطانیہ کی سب سے بڑی دشمن تسلیم کی جاتی ہے۔ اور روس کے اثر سے بڑی حد تک متاثر ہے۔

ہر چند اس وقت تک تمام ملک چین میں ہم آہنگی پیدا نہیں ہوئی ہے اور نہ اتنے بڑے ملک میں اس قدر جلد اس کا امکان ہے۔ لیکن یہ یقینی ہے کہ اب یہ تحریک وہاں کامیاب ہو کر رہیگی اور ہندوستان کی طرح اس پر وہ دور نہیں آئے گا جس کیلئے دوبارہ حشر کی ضرورت ہے۔

کائنات کی شعاعیں اور عناصر کی تخلیق

نور کتنا ہی تیز و شدید ہو لیکن ایک باریک سا ورق کاغذ کا بھی اس کے لئے حجاب ہو جاتا ہے۔ ۱۸۹۴ء تک یہ حقیقت مسلمہ عام تھی لیکن ۱۸۹۵ء میں ایک اور شعاع دریافت ہوئی جو نور آفتاب سے زیادہ قوی تھی اور جو گوشت اور لکڑی کے اندر سے بھی نفوذ کر جاتی ہے۔ اس کا نام شعاع رنتجنی ہے۔ یہ شعاع باوجود اس قدر قوی ہونے کے سونا، ہڈی اور سیسہ میں بالکل نفوذ نہیں کر سکتی۔ لیکن اب معلوم ہوا ہے کہ فضا سے ایک اور شعاع اس قیامت کی پیدا ہوتی ہے جو سیسہ کی ۱۷-انچہ کی موٹی تختی سے بھی گزر جاتی ہے۔ یعنی یہ شعاع رنتجنی شعاع سے ۴۰۰ گنا زیادہ قوی ہے۔

اس شعاع کے دریافت میں ایک جرمنی، ایک امریکی اور دو سوئٹزرلینڈ کے دماغ مشترک تھے۔

یہ شعاعیں نہ صرف فضاء ارض سے باہر بلکہ کہکشاں سے بھی پرے جو فضاء ہے وہاں سے آتی ہیں۔ اور اس سے یہ امر ثابت ہوتا ہے کہ عمل تکوین اب بھی کائنات میں جاری ہے اور وہ دقیق ذرات جو مادہ کی تخلیق کا باعث ہوتے ہیں اب بھی اپنے کام میں مصروف ہیں۔

پروفیسر ملکن کا بیان ہے کہ مادر ابخوم جواہر ہڈروجین اور ہلیوم کے چار عناصر بنتے ہیں۔ آکسیجن جو حیات کے لئے ضروری ہے، مگنیزیم جو روشن ہو جاتی ہے اور جس کی روشنی میں رات کو تصویریں لیجاتی ہیں سلکون جو ریت اور شیشہ کی ترکیب میں داخل ہے اور چوتھے لوہا۔

امریکہ کی آبادی

یکم جولائی کی مردم شماری سے ثابت ہوتا ہے کہ امریکہ میں اس وقت ۱۲۰ ملین (۱۲ کرور) آدمی پائے جاتے ہیں۔ ۱۹۲۰ء میں یہاں کی آبادی ساڑھے دس کرور تھی۔ گزشتہ ۸ سال میں ڈیڑھ کرور آبادی بڑھ گئی۔ جس کا بڑا سبب وہاں کا محکمہ حفظان صحت ہے جو شہروں کی صفائی اور امراض کے دور کرنے کی تدابیر میں پوری سعی کرتا ہے اور دوسرا سبب وہاں کی ماؤں کا تعلیم یافتہ ہونا ہے جو بچوں کی پرورش کے اصول کو

جانتی ہیں اور ان کی عمر طبعی تک پہونچنے میں معاون ہوتی ہیں۔

کتابیں فلم کی صورت میں

ڈاکٹر ہونٹی نے جو برتی کمپنی کا مہتم ہے اس نے فلم بنانے کا ایک ایسا طریقہ ایجاد کیا ہے جس کی مدد سے تمام کتابیں بجائے کاغذ پر چھپنے کے فلم میں منقوش ہونگی اور جن کا مطالعہ بجائے آنکھ کے کان سے ہوا کرے گا۔ اس سے نہ صرف یہ فائدہ ہوگا کہ وقت کم صرف ہوگا بلکہ دماغ پر بھی زیادہ زور نہ پڑے گا۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ ان کتابی فلموں کی قیمت بھی معمولی کتابوں کی قیمت کی طرح ہوگی اور ہر لاسلکی دوکان سے ملسکیں گی۔

کپڑے کے ہوائی جہاز

جرمنی کے ایک سائنس داں نے لکڑی اور کپڑے کو مختلف دھاتوں کے پانی میں غسل دیکر فولاد کی طرح مضبوط بنا دینے کے کامیاب تجربات دکھائے تھے خیال کیا جاتا ہے کہ دھات کے پانی میں غسل دیئے ہوئے کپڑے کو اب ہوائی جہازوں کی تعمیر میں صرف کیا جائیگا اور اس طرح نہایت مضبوط مگر ہلکے ہوائی جہاز تیار ہونے لگیں گے۔ ان میں پٹرول رکھنے کے خانوں کو ہر قسم کے خطرات سے محفوظ بنا دینے کا انتظام کر لیا گیا ہے۔

گرافون کے نئے ریکارڈ

گرافون کے نئے ریکارڈ تیار ہوئے ہیں جو بہت باریک ہیں اور اس درجہ ملایم ہیں کہ اگر انہیں لپیٹ کر کسی نلکی میں رکھ لیا جائے تو انھیں کوئی نقصان نہیں پہونچتا یہ ریکارڈ فروخت کے لئے بازار میں آنے والے ہیں۔

ضرورت ہے

اگر آپ کو خیمے، دریاں اور چرمی سامان کی ضرورت ہو تو فوراً ہمیں ایک کارڈ لکھئے۔ ہمارے یہاں ہر قسم کا سامان نہایت ارزاں ملتا ہے والی ریاست بڑے بڑے رؤسا ہمارے ہی یہاں سے مال منگاتے ہیں۔

فہرست اردو یا انگریزی کی منگا کر ملاحظہ فرمایئے

ہمارا کارخانہ صداقت کیوجہ سے تمام ہندستان میں مشہور ہو گیا ہے۔

المشتہر

محمد حسین اینڈ کونٹ مرچنٹ فتحگڑھ (یو۔پی)

ہماری شہرت گزشتہ ۲۰ سال سے قایم ہے

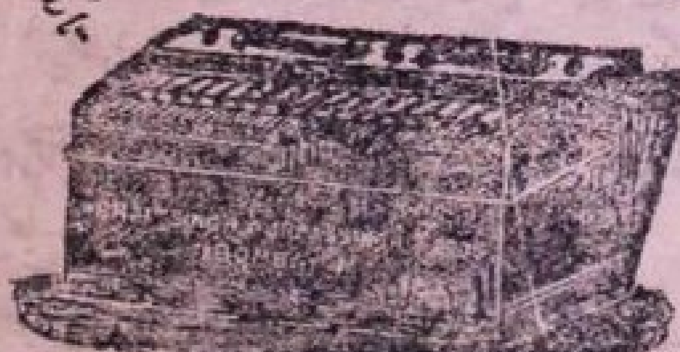

اگر آپ کو بہترین قسم کے ایسے ہارمونیم درکار ہیں جو آپ کی زندگی کا ساتھ دیکیں تو صرف ہم سے خط و کتابت کیجئے۔ ہمارے یہاں کے بنے ہوئے ہارمونیم اس قدر شیریں سروں کے ہیں کہ کہیں اور مل ہی نہیں سکتے صرف ہمیں ایسے ہارمونیم بناتے ہیں قیمت مختلف ہیں۔ فہرست مفت۔

Chait-Singh, Gurbak Singh & Bros.
292 N. Sandhurst-Road
Bombay (4)